MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

(University with Potential for Excellence)

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION

B.A. URDU DEGREE COURSE
FIRST YEAR

PAPER : II

PROSE AND GRAMMAR

www.mkudde.org

5011
UURD02

B.A. URDU DEGREE COURSE

FIRST YEAR

PAPER:II PROSE AND GRAMMAR

پرچہ نمبر 2 : نثر اور قواعد

MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

INSTITUTE OF DISTANCE EDUCATION

PALKALAI NAGAR,

MADURAI - 625 021

MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

(University with Potential for Excellence)

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION

Palkalai Nagar, Madurai – 625 021, India

Ph : 0452 – 2458471 (30 Lines)   Fax : 0452 – 2458265

E-mail	:mkudde@mkudde.org
General grievances	:mkudde grievances@gmail.com
UG Courses	:mkuddeug@gmail.com
PG Courses	:mkupg@gmail.com
MBA Courses	:mkuddembag@gmail.com
MCA Courses	:mkuddemcag@gmail.com
Education Courses	:mkuddeedu@gmail.com
Website	:www.mkudde.org
IVRS	:0452 – 2459990
	: 0452 - 2459596

Student Support Service : 0452 – 2458419

DDE – Examinations	
Fax	: 0452 - 2458261
E-mail	: mkuace@yahoo.com
Examn. Grievance Redress Cell	: 0425 – 2458471 – Extn. 515

Reading Material Disclaimer

This reading material, developed by **Dr. Syed Sajjad Husain, Professor & Head Department of Arabic Persian and Urdu**, University of Madras, Chennai is an aid for the students of Directorate of Distance Education, Madurai Kamaraj University, to understand the course content. It is only for the registered students of DDE, MKU and is not for private circulation.

©All copy rights & privileges are reserved

FIRST YEAR

PAPER-II - PROSE AND GRAMMAR

Time : 3 hours Max.Marks: 100

PROSE

1.Ghalib Ke Khutoot - by Mirza Ghalib

2.Intekhab-e-Mazameen-e-Sir Syed – by Al-e-Ahmed Suroor

3.Ifadat-e-Mehdi – by Mehdi Ifadi

Books Recommended

1.Ghalib Shair-o-Maktoob Nigar– By Prof.Noorul Hasan Naqvi

2.MutalaeSir Syed Ahmed Khan – By Maulvi Abdul Haq

3.Sir Syed Aur Unke Karnamay – By Prof.Noorul Hasan Naqvi

4.Sir Syed Aur Unke Namwar Rufaqa–By Syed Abdullla

GRAMMAR

1.Ism Aur Uski Qismein

2.Zameer Aur Uski Qismein

3.Sifat Aur Uski Qismein

4.Fael Aur Uski Qismein

5.Alaamat-e-Faael Ne Banane Ke Qaidey

6.Alaamat-e-Maful Ku Banane Ke Qaidey

7.Tazkeer Wa Tanees

Books Recommended

1.Qawaid-e-Urdu– By Maulvi Abdul Haq

2.Urdu Grammaer – By Yaqoob Aslam

Pr nted at V ma a Note book
Cop es- 500 F rst print

First Year B.A. Urdu

Paper-II Prose and Grammar

اکائی نمبر:1 غالب کے خطوط

ساخت:

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تمہید

1.2 غالب کی خطوط نگاری

1.3 خطوط کی اشاعت

1.4 خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ

1.5 القاب وآداب-سلام ودعا اور شوخی وظرافت

1.6 تعزیتی خطوط

1.7 حسن بیان، سادگی، رنگینی اور مرقع کشی

1.8 علمی نثر -استدلالی نثر

1.9 خطوط غالب کے نمونے

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ غالب کی خطوط نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں

☆ خطوط غالب کی اشاعت سے متعلق جانکاری حاصل کر سکیں

☆ خطوط غالب کے مجموعوں سے روشناس ہو سکیں

☆ غالب کی خطوط نگاری کی خصوصیات کا جائزہ لے سکیں۔

1.1 تمہید:

اس اکائی میں ہم غالب کی خطوط نگاری سے متعلق جانکاری دیتے ہوئے ان کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالیں گے۔ غالب کے خطوط کے سلسلہ میں یہ بتائیں گے کہ انہوں نے اردو میں خطوط لکھنے کو کیوں ترجیح دی جب کہ زمانہ کی روش فارسی میں لکھنے کی تھی۔ غالب کے خطوط کے مجموعوں سے روشناس کراتے ہوئے ان کی سنہ اشاعت سے واقف کرائیں گے۔ نیز غالب کی خطوط نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے، غالب کے خطوط کا متن پیش کریں گے اور سوال و جواب کے ذریعہ غالب کے خطوط کی تفہیم کو آسان بنانے کی کوشش کریں گے۔

1.2 غالب کی خطوط نگاری

غالب کے اردو خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ خطوط جو کسی مقصد کے تحت لکھے گئے اور وہ خطوط جو تفریح کے طور پر یعنی مکتوب نگاری کے شوق کی تکمیل کے لیے لکھے گئے۔ حساب لگایا جائے تو ان شوقیہ خطوط کا پلہ بھاری نظر آئے گا۔ دراصل اس کام کا آغاز تو ضرورتاً ہوا تھا مگر آخرکار اس کام میں ایسا جی لگا کہ اس نے تفریحی مشغلے کی شکل اختیار کرلی۔ ایک خط میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں؛

> ''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہوجاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا

ہے۔''

میر مہدی مجروح سے خط لکھنے کا تقاضا ان لفظوں میں کرتے ہیں ؛

''خط لکھنے میں تردد نہ کرو اور ڈاک میں بے تامل بھیجا کرو۔''

منشی شیونراین آرام کو لکھتے ہیں ؛

''بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے ۔ خیر دیر سے لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے ۔''

مرزا تفتہ کا خط آنے میں دیر ہوئی تو بے چین ہو کر یہاں تک لکھ دیا؛

''کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار جاری ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے۔''

تفتہ ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں ؛

''یہ کیا سبب، دس دس بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے ۔ خط لکھو صاحب ۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔''

تفتہ کے نام دو اور خطوں کے اقتباس ملاحظہ ہوں :۔

''ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔''

اور

''بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔''

ایک خط میں حاتم علی مہر سے شکایت کرتے ہیں :۔

''کیا تم نے مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کیا بات

تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیرو
عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔"

غالب بلا تاخیر خطوں کا جواب دیتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے بھی اصرار کرتے تھے کہ پابندی سے خط لکھیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق سارا دن خط پڑھنے اور جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ شعر صرف رات کے وقت عالمِ سرور میں کہتے تھے۔ اس عالم میں لکھنا دشوار ہوتا تھا۔ اس لیے کمر بند میں گرہیں لگا لیتے تھے۔ صبح کو شعر یاد کر کے لکھتے جاتے اور گرہیں کھولتے جاتے لیکن یہ روز کا معمول نہ تھا۔ ایک مدت اس طرح گزری کہ شعر گوئی کی طرف دل مائل ہی نہ ہوا صرف مکتوب نگاری کا شغل ایسا تھا جس نے ہمیشہ دل بستگی کا سامان فراہم کیا۔ خط پڑھنے اور جواب لکھنے سے جو وقت بچ رہتا تھا وہ لفافے بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ منشی شیونراین آرام کو لکھتے ہیں:۔

"لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔"

منشی بنی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا
لفافے بناؤں گا۔"

لفافوں کے سلسلے میں غالب کی نفاست پسندی بھی قابلِ ذکر ہے۔ ایک بار منشی شیونراین آرام نے کچھ لفافے بھیجے۔ ہر لفافے پر یہ عبارت چھپی ہوئی تھی کہ یہ خط کس مقام سے کس تاریخ کو روانہ کیا گیا اور اس کی منزل کیا ہے۔ منشی جی کو لوٹا دیے۔ لفافے واپس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آج اس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے آیا۔ دل خوش ہوا۔ بھائی میں
اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے از مقام و در مقام و تاریخ و ماہ مجھ کو
پسند نہیں۔ آگے جو تم نے مجھے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ
دیے۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کے عوض یہ

لفافے جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو اور اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں۔''

دیکھا آپ نے یہ ہے غالب کا مزاج۔ لباس، خوراک، کتابت، طباعت، لفافوں کا انتخاب ہر معاملے میں وہ بے حد نفاست پسند ہیں۔ انھوں نے خود ہی فرمادیا ''بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں'' ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ان کا کلام نظم ونثر صحت ونفاست کے ساتھ شایع ہوکر ہر طرف پھیل جائے۔

1.3 خطوط کی اشاعت:

غالب نے اردو میں خط لکھنے شروع کیے تو یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ سرسری طور پر لکھے گئے یہ خط اتنی جلدی ہر طرف مقبول ہوجائیں گے اور یہ بات تو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی ہوگی کہ ایک دن احباب ان کی اشاعت کا تقاضا کریں گے۔

یہ خطوط جو بغیر کسی اہتمام وتکلف کے لکھے گئے تھے دوستوں اور عزیزوں میں بہت پسند کیے گئے، ایک دوسرے کو پڑھ کر سنائے گئے اور عزیز شاگرد اردو ادب کے اس بیش قیمت سرمایے کو محفوظ کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ غالباً منشی شیونراین آرام نے غالب کے نام اپنے کسی خط میں ان خطوط کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ تجویز غالب کو پسند نہیں آئی۔ جواب میں لکھتے ہیں:۔

> ''اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطعِ نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا جانا میرے خلافِ طبع ہے۔''

غالب نے اپنے خطوط کی اشاعت کے خلاف رائے تو دے دی لیکن اپنے پرستاروں کی رائے کے آگے سر جھکانا بھی پڑا۔ اب انھیں اپنی ''تحریر سرسری'' کی دلکشی کا اندازہ ہوا اور یہ بھی یقین ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن یہ خطوط ضرور چھپ کے رہیں گے۔ اب وہ ذرا قلم سنبھال کے لکھنے لگے۔ خطوں کی دل فریبی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ادھر شاگرد اور دوست اپنی رائے پر قائم رہے اور شاید باہمی مشورہ بھی جاری رہا۔ منشی شیونراین آرام اور مرزا ہرگوپال تفتہ ان میں پیش پیش تھے۔ اب کی بار آرام نے نہیں تفتہ نے خط لکھا۔ جواب میں فرماتے ہیں:۔

> ''رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔''

یہ تو لکھ دیا کہ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے لیکن اب وہ پگھلتے اور ہتھیار ڈالتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ جملہ کہ اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے، صاف بتا رہا ہے کہ وہ نیم رضامند ہیں۔ یہی نہیں بلکہ رقعات کی فراہمی کی مہم کا آغاز ہوتا ہے تو وہ معاون و مددگار نظر آتے ہیں۔ اب ان کی خوشی اسی میں ہے کہ یہ خطوط چھپیں اور جلد چھپیں۔

ساری زندگی غالب کی کوشش یہ رہی کہ ان کا دیوان زیادہ سے زیادہ صحت اور بہترین طباعت کے ساتھ شایع ہو۔ اگر اپنے خطوط کی اشاعت میں انھوں نے تعاون کیا تو اس میں حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

خطوط غالب کا پہلا مجموعہ ''عودِ ہندی'' ان کی وفات سے پونے چار مہینے قبل شایع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''اردوئے معلیٰ'' چھپنا تو ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن مکمل ان کی وفات کے بعد ہوا۔ رقعات کے متعدد مجموعے اس کے بعد شائع ہوئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

مکاتیب غالب (۱۹۳۷ء):

غالب نے ریاست رام پور کے نوابین کے نام جو خطوط لکھے ان میں سے بیشتر وہاں محفوظ تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کرنل بشیر حسین زیدی کی فرمائش پر انھیں نہایت سلیقے سے ترتیب دیا اور ریاست کے خرچ پر اسے بہت اہتمام سے شائع کیا گیا۔ یہ مجموعہ ایک سو ستر خطوط پر مشتمل ہے۔ اس میں منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے گئے چوہتر خطوط شامل ہیں۔ ادارۂ نادرات کراچی سے شائع ہوئے۔

ادبی خطوطِ غالب (۱۹۳۹ء):

مرزا محمد عسکری نے ایسے خطوط کو یکجا کر دیا ہے جن میں مکتوب نگار نے ادبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

خطوط غالب (۱۹۴۱ء):

مولوی مہیش پرشاد نے غالب کے تمام خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی سے شائع ہوئی لیکن مولوی صاحب کی وفات کے سبب دوسری جلد شائع نہیں ہو سکی۔

نادراتِ غالب (۱۹۴۹ء):

اس میں منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے گئے چوہتر خطوط شامل ہیں۔ ادارۂ نادرات کراچی سے شائع ہوئے۔

خطوطِ غالب (۱۹۵۱ء):

مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے تمام خطوط بہ استثنائے مکاتیبِ غالب و نادراتِ غالب یکجا کر کے کتاب منزل لاہور سے شائع کیے۔

غالب کے خطوط (۱۹۸۴ء):

ڈاکٹر خلیق انجم نے چار جلدوں میں غالب کے تمام خطوط کو یکجا کیا ہے۔ مولانا عرشی کے بعد یہ

دوسرا کام ہے جو نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے اور جس پر بہت محنت صرف ہوئی ہے۔ غالب کی زندگی میں غالب کے خطوط اس اہتمام سے شائع نہ ہوسکے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ تاہم اس زمانے میں یہ بھی غنیمت تھا کہ ایک مجموعہ ان کے سامنے شائع ہوگیا۔ دوسرا مجموعہ چھاپہ خانے میں تھا اور امید تھی کہ جلد وہ بھی منظر عام پر آجائے گا۔ غالب اس صورتِ حال سے مطمئن تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ بقائے دوام کے دربار میں انھیں بلند رتبہ حاصل ہوگیا۔ فرماتے ہیں:۔

"نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔"

☆☆☆

1.4 خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ

غالب کے خطوں میں کچھ ایسی جادو کی سی تاثیر ہے کہ یہ خطوط جس کی نظر سے ایک بار گزر رے گئے وہ ان کی دلکشی کا قائل ہوگیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے لکھے گئے ان خطوں کی تازگی میں آج تک کمی نہیں آئی بلکہ ان کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی تصنیف وجود میں آنے کے ساتھ ہی قبولِ عام کا شرف حاصل کرلے اور یہ مقبولیت عرصۂ دراز تک برقرار رہے۔ خطوطِ غالب کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ان خطوں کا ایک کمال یہ ہے کہ خط کسی کے نام ہو، پڑھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ مکتوب نگار ہم سے ہی محوِ گفتگو ہے: ہر اک کو یہ گماں کہ مخاطب ہمیں سے ہیں۔

خطوطِ غالب کی اس مقبولیت کا راز کیا ہے؟ اس دلکشی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ آخر وہ کیا خصوصیات ہیں جنھوں نے ان خطوں کو خاص و عام میں ایسا مقبول بنادیا کہ ان کے بغیر اردو ادب کا مطالعہ نامکمل ہے؟ آیئے ان سوالوں کا جواب تلاش کریں۔

غالب کی خطوط نگاری کی خصوصیات:

غالب اپنے ایک خط میں منشی شیو نراین آرام کو لکھتے ہیں ''بھائی، میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں'' اور مزاج ان کا یہ تھا کہ بڑے سے بڑے شاعر و ادیب کی پیروی کو کسرِ شان خیال کرتے تھے۔ ساری زندگی اپنا راستہ آپ نکالا اور سب سے الگ نکالا۔ گویا وہ بہت جدت پسند واقع ہوئے تھے۔

جدت پسندی:

غالب کے زمانے تک مکتوب نگاری کے جس اندازِ کا رواج تھا اسے وہ ''محمد شاہی روش'' کہتے تھے۔ اس روش کو وہ بے حد ناپسند کرتے تھے اور یہ ہمیشہ اس پر طنز کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:۔

> ''تم کو خط نویسی کی محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ یہاں خیریت ہے، وہاں کی خیریت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا، جی خوش ہوا۔''

دیکھا آپ نے، کیا طنز ہے اس عبارت میں۔ غالب نے مکتوب نگاری کے اس پرانے طریقے سے دامن بچایا اور اس روش سے ہٹ کر اپنا راستہ نکالا۔ ان کے خطوط کی سب سے اہم خصوصیت یہی ہے۔ اب اس کے ثبوت پیش کیے جاتے ہیں:

1.5 القاب و آداب:

اس زمانے میں دستور تھا کہ مکتوب الیہ کی خوشنودی کے لیے لمبے لمبے القاب لکھے جاتے تھے۔ ان القاب کو نثری قصیدہ کہنا چاہیے۔ مکتوب الیہ کی جتنی تعریف ممکن تھی وہ سب شروع میں ہی کر دی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اس کا ذکر ایک فارسی عبارت میں کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں میرا طرزِ نگارش یہ ہے کہ جب کاغذ و قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق کسی لفظ سے پکارتا ہوں اور کام کی بات لکھ دیتا ہوں۔ القاب، آداب، خیریت و مزاج پرسی غیر

ضروری باتیں ہیں۔ انھیں قلم انداز کردیتا ہوں۔ فارسی عبارت یہ ہے:۔

''ہنجار من درنگارش ایں است کہ چو کلک و ورق بہ کف گیرم مکتوب الیہ رابہ لفظے کہ دراخورِ حالتِ اوست درسرِ آغازِ صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنجِ مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیرت گوئی و عافیت جوئی حشو و زوائد است و پختگاں حشو را دفع نہند۔''

یہی بات ایک اردو مکتوب میں بھی دہرائی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

''ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ غالب نے لمبے لمبے القاب ترک کرکے مختصر القاب کی بنیاد ڈالی۔ مثلاً:۔

بھائی، میاں، برخوردار، صاحب، میری جان، مہاراج، جانِ برادر، جانِ غالب، قبلہ و کعبہ، بندہ پرور، سید صاحب، کہیں یہ انداز ہے:۔

یوسف مرزا، جی مرزا تفتہ، میاں مرزا تفتہ، اجی مولانا علائی، بعض خطوں میں لمبے لمبے القاب بھی نظر آتے ہیں جیسے:۔

نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان عالی شان والا دودمان زاد مجدکم

یا

مشفق و مہربان نواب کلب علی خاں کو غالب نیم جان کا سلام قبول ہو۔

اور

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ

میرے مہربان میری جان میرزا تفتہ سخن دان

گویا بعض جگہ لمبے القاب بھی استعمال کرتے ہیں اور قافیے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ کہیں اس

کا مقصد ہے مکتوب الیہ کو خوش کرنا اور کہیں یہ جتانا کہ ہم قافیہ پیمائی کے ہنر میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

رنگ برنگے ان القاب و آداب کے پہلو بہ پہلو بے القاب کے خطوط بھی نظر آتے ہیں جہاں مکتوب الیہ کو مخاطب کیے بغیر وہ مدعا نگاری کا آغاز کر دیتے ہیں۔ گویا بلا تمہید کام کی بات کہہ دیتے ہیں۔

الغرض غالب نے القاب و آداب کے پرانے طریقوں کو بالائے طاق رکھا اور بالکل نئے انداز کی بنیاد ڈالی۔

۲۔ اپنا نام:

زمانۂ قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ خط کے خاتمے پر مکتوب نگار اپنا نام لکھتا ہے اور نہ لکھے تو کیسے معلوم ہو کہ خط کس کا ہے۔ نام سے پہلے کچھ لکھنے کا دستور بھی بہت پرانا ہے۔ مثلاً آپ کا نیاز مند، آپ کا فرمانبردار بیٹا، آپ کا خادم وغیرہ۔ یہ دستور آج تک جاری ہے مگر غالب کو یہ گھسی پٹی باتیں ناپسند تھیں۔ یہاں بھی انھوں نے جدت سے کام لیا۔

خط کے آخر میں کہیں صرف غالب لکھتے ہیں کہیں صرف اسد تو کہیں اسد اللہ یا اسد اللہ خاں، کچھ خطوں میں اپنے نام کا قافیہ ملایا ہے، اس طرح؛

جواب کا طالب غالب، اس خط کی رسید کا طالب غالب،

عافیت کا طالب غالب، نجات کا طالب غالب،

رحم و کرم کا طالب غالب، مرگِ ناگہاں کا طالب غالب

ایک خط میں لکھتے ہیں: راقم اسد، ایک جگہ صوفیوں کا انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے، غالب علی شاہ، ایک اور جگہ غالبِ بےنوا، اسد یک رنگ،

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ''نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔''

مولانا علائی کے نام کے خط میں لکھتے ہیں ''کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ''

میر سرفراز حسین کے نام ایک خط میں بہت مزیدار انداز اختیار کیا ہے، خط کے آخر میں لکھتے ہیں ''دیکھو ہم

اپنا نام نہیں لکھتے، بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔'' بہت سے خط ایسے ہیں کہ اپنا نام لکھے بغیر خط ختم کر دیا ہے۔ ان کی تحریر کون نہ پہچانتا ہوگا اور انھیں کون نہ جانتا ہوگا ''ایسا بھی کوئی ہوگا کہ غالب کو نہ جانے؟''

یہاں بھی انھوں نے اپنا راستہ سب سے الگ نکالا۔

۳۔ تاریخِ تحریر:

غالب اپنے خطوں میں تاریخ تحریر کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ کچھ خط ایسے بھی ہیں جن پر تاریخ درج نہیں۔ لیکن عام طور پر وہ تاریخ لکھتے ہیں بلکہ اکثر تو ہجری کے ساتھ عیسوی سنہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ اس طرح:

''۱۴ رجب المرجب ۱۲۸۱ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴۔''

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''آج یک شنبہ کا دن، ساتویں فروری ۱۸۵۸ء کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی ۱۲۷۰ھ کی ہے۔''

اکثر دن کے ساتھ وقت بھی لکھتے ہیں:۔

صبح دوشنبہ شانزدہم از مہٗ ماہِ صیام ۱۲۸۱ یعنی ۱۳ فروری ۱۸۶۵۔

منگل کا دن ۲۳ جمادی الثانی ۱۶ دسمبر پہر دن چڑھے۔

۶ دسمبر ۱۸۶۵ کہ بدھ کا دن ہے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔

کسی کسی خط میں تو تاریخ کے علاوہ بھی لکھ دیا ہے کہ جس دن خط ملا اسی دن جواب لکھ دیا یا جس وقت خط ملا اسی وقت جواب لکھ دیا۔

''آج دوشنبہ ۶ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ

پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا، ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھا۔"

بعض خطوں میں اسی بات کو یوں بھی لکھا ہے:۔

"وقتِ ورودِ خط، وقت رسیدن خط"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یکشنبہ ہفتم فروری ۱۸۵۸ء وقتِ رسید نامہ۔"

زمانۂ قدیم سے آج تک یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ تاریخ تحریر خط کے شروع میں لکھتے ہیں یا خاتمے پر غالب کی روایت شکنی نے اسے بھی برقرار نہ رکھا۔ وہ کبھی خط کے شروع میں تاریخ لکھتے ہیں کبھی آخر میں اور کبھی درمیان میں، ایک اور دلچسپ طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ کسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ بھی اور اکثر دن بھی بتا دیتے ہیں۔ مثالیں دیکھئے:۔

"میری جان، سن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ۔

ایک مژہ برہم زدن مینھ نہیں تھما۔"

۔۔۔۔کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو بڑے زور کی آندھی آئی۔

گویا تاریخ تحریر میں بھی غالب نے طرح طرح کی جدتیں کیں۔

۴۔ سلام و دعا:

خط میں دوستوں اور عزیزوں کو دعا سلام لکھنے کی رسم بہت پرانی ہے۔ اس کے لیے نہ جانے کیوں ایک خاص جگہ بھی مقرر ہے۔ خط ختم ہونے کے بعد اپنا نام لکھنے سے پہلے دوستوں عزیزوں کو سلام دعا لکھ کر ایک بوجھ سا اتار دیا جاتا ہے۔ ہم کسی کا احترام کرتے ہیں تو خط کے آغاز میں اسے سلام کیوں نہیں لکھتے؟ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس کے نام کو آخر میں جگہ کیوں دیتے ہیں؟ جواب یہ کہ سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔ ایک لکیر ہے جسے سب پیٹتے چلے آئے ہیں۔

خطوط غالب کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی روشِ عام پر چلنا انھوں نے

اپنی شان کے خلاف جانا۔ سلام دعا کہیں خط کے شروع میں لکھتے ہیں، کہیں درمیان میں تو کہیں آخر میں۔ اس عام سی بات کے لیے بھی ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو لطف و سرور حاصل ہو۔

میر مہدی مجروح کے نام خط کے درمیان میں کئی دوستوں کو اس طرح سلام دعا لکھتے ہیں:۔

''میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیر الدین کو دعا اور شفیع احمد کو سلام کہنا، میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ بس یہ خط پڑھا دو۔''

فرسودہ طریقے کو ترک کر کے سلام دعا خط کے درمیان میں لکھا ہے اور وہ بھی دلچسپ انداز میں۔

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔ میر سرفراز حسین کے نام لکھے گئے ایک خط کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

''میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی، بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے، اب میں نہیں جانتا، یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے، دعا سلام کی حاجت کیا؟''

اور میر مہدی مجروح کے خط میں احباب کو اس طرح یاد کرتے ہیں:

''مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ ہاہاہا میر افضل علی صاحب کہاں ہیں؟ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا ان کو ہماری دعا

کہنا۔''

۵۔ بات چیت کا انداز:

خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مکتوب دو اشخاص کے درمیان بات چیت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ضبطِ تحریر میں آجاتی ہے لیکن ہوا یہ کہ قدیم مکتوب نگاروں نے نامہ نگاری میں تصنع بناوٹ اور عبارت آرائی سے کام لیا اور اسے بے تکلفی سے محروم کر دیا جو اس کا فطری حق تھا۔ غالب نے ایسا انداز اختیار کیا جیسے دو لوگ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ گویا انھوں نے خط کو نصف ملاقات نہیں مکمل ملاقات بنا دیا اور اس پر انھیں بجا طور پر فخر تھا۔ مرزا حاتم علی مہر کو بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

''مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:۔

''بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت، مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزہ معلوم ہوتا۔

مرزا ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

''بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔''

منشی نول کشور کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:۔

''میں نے آسان راستہ اپنا لیا ہے۔ جو کچھ لکھتا ہوں اردو میں لکھتا ہوں۔ نہ

سخن آرائی نہ خودنمائی۔تحریر کو گفتگو بنالیا ہے۔''

غالب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے نامہ نویسی کو بے تکلف بات چیت بنادیا۔ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

۔۔۔۔کیوں صاحب! روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟

۔۔۔۔اہاہاہا، میرا پیارا مہدی آیا۔آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو۔

۔۔۔۔آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ۔

میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ خبریں سنو۔

ایک اور خط کا ڈرامائی انداز دیکھئے:۔

''ارے کوئی ہے! ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔لو صاحب وہ آئے۔''

نہ کوئی یوسف مرزا کو بلانے گیا، نہ وہ آئے۔ یہ سب تخیل کی کارفرمائی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ یوسف مرزا کو مخاطب کرنا منظور ہے۔ میرن صاحب کے نام ایک خط کا آغاز اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے لکھتے ہیں:۔

''میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔حضرت آیئے!
السلام علیکم۔مزاج مبارک؟''

یہاں نہ میرن صاحب کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا۔ نہ انھیں بلوایا گیا، نہ وہ تشریف لائے۔ یہ مراسلے کو مکالمہ بنانے کی کوشش ہے اور کامیاب کوشش ہے۔

۶۔مکمل ڈراما:

غالب کے قلم سے ایسے بھی مکاتیب وجود میں آئے جو مکمل ڈراما ہیں۔ یہاں ہم کچھ سنتے نہیں اپنی آنکھوں کے آگے پیش آتے دیکھتے ہیں۔اور اب دیکھیے اس کی ایک مثال:

''اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم''

''حضرت آداب''

''کہو صاحب، اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟''

''حضور کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں۔ تپ جاتی رہی ہے ۔صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہوجائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟''

''نہیں میرن صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔، وہ خفا ہوتا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔''

''حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔آپ سے خفا کیا ہوں گے۔''

''بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟''

''سبحان اللہ۔ اے لو حضرت! آپ خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔''

''اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟''

''کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جائے۔ میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔''

''میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھلا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ۔

سنو میر مہدی صاحب! میرا کچھ گناہ نہیں۔''

یہ خط میر مہدی کے نام ہے اور اس کا لب لباب آخری جملہ ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ تمھارے خط کے جواب میں جو تاخیر ہوئی اس کا ذمہ دار میں نہیں میرن صاحب ہیں۔ انداز ایسا اختیار کیا جیسے غالب اپنے بالا خانے کی بالکنی میں تشریف رکھتے ہیں، میرن صاحب اس طرف گزر رہے ہیں۔ غالب آواز دیتے ہیں سلام دعا ہوتی ہے۔ پوچھتے ہیں میرن صاحب تم میر مہدی کے خط کا جواب کیوں نہیں لکھنے دیتے۔ دو چار سوال جواب میں حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ میرن صاحب چاہتے ہیں غالب کا خط میر مہدی کو اس وقت ملے جب یہ بھی ان کے پاس ہوں تاکہ خط پڑھیں اور لطف لیں۔ مکتوب نگار نے یہ بات خود نہیں کہی میرن صاحب کی زبان سے کہلوادی۔ اس کوشش مین ایک مکمل ڈراما وجود میں آ گیا۔

۷۔ شوخی و ظرافت:

غالب کے مزاج میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ مولانا حالی نے انھیں حیوان ظریف کہا تو بجا کہا۔ زندگی کے آخری ایام بیماری اور ناداری میں گزرے مگر خوش مزاجی میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ ان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ ملاقاتی ان سے مل کر خوش ہو جائے۔ مکتوب الیہ ان کے خط سے لطف اندوز ہو۔ گفتگو کو ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ سے پر لطف بنا دیتے تھے۔ احباب ان کے پرستار تھے، ان سے ملاقات کے خواہش مند اور ان کے مکتوب کے مشتاق رہتے تھے۔ چٹکلے، لطیفے، ظرافت آمیز باتیں ان کے خطوں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ انھوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ۱۲۷۷ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاؤں گا ”غالب مُرد“ سے یہ تاریخ نکالی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ احباب و شاگرد جو خدمت کر سکتے ہیں کر لیں۔ سال گزر گیا تو ایک بے تکلف دوست نے چھیڑنے کو لکھا کہ پچھلے سال تو عام وبا بھی پھیلی مگر الحمد للہ آپ زندہ سلامت رہے۔ باتوں میں انھیں کون ہرا سکتا تھا۔ جواب میں لکھتے ہیں:۔

> ”میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لایق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعدِ رفعِ فسادِ ہوا سمجھ

لیا جائے گا۔''

اسی وبا کے بارے میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :۔

''وبا کہاں تھی جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا۔''

امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی مرگئی اور وہ تیسری شادی کا ارادہ کرنے لگے۔ اس کے بارے میں تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ایک اور پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟''

کسی نے شکایتاً کہا کہ غالب روزہ نہیں رکھتے۔ اس کے بارے میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :۔

روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔''

خطوط غالب میں ظرافت کی ایسی دلکش مثالیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں اور ان خطوں کی مقبولیت میں اس ظرافت نے بہت اضافہ کیا ہے۔

1.6 تعزیتی خطوط:

غالب کی شوخی وظرافت کا ذکر کرنے کے بعد تعزیتی خطوط کا ذکر کرنا بہت بے جوڑ اور نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ظرافت تو ان کی سرشت میں داخل تھی کہ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے اور دل آسائی و دلجوئی ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔'' لیکن غم کسی کا بھی ہو ان کے دل کو تڑپا دیتا ہے اور موت کسی کی بھی ہو ہو ماتم گسار نظر آتے ہیں۔ ایک انگریز مارا گیا تو حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک مکتوب مین ان کے قلم سے بے اختیار یہ جملہ ٹپک پڑا۔ ''ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے'' بہت سے دوست دنیا سے رخصت ہو گئے تو لکھا ''ہائے اتنے دوست مرے کہ اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا''

غالب نے غموں کو ہنسی میں اڑانا سیکھ لیا تھا۔ اچھے دنوں کے کپڑے فروخت کر کے گزر کرنی پڑی تو فرمایا ''لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑے کھاتا ہوں'' جب ہر طرف سے مصائب کا ہجوم تھا اور زندگی دشوار تھی تب بھی وہ اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ قربان علی بیگ خاں سالک کو لکھتے ہیں:۔

> ''یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔۔۔۔ آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت

نواب صاحب یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا''

ایسا حوصلہ مند انسان تعزیتی خطوں میں ظرافت کا سہارا لے کر پسماندگان کا غم دور کرنے کی کوشش کیسے نہ کرے گا۔ مرزا حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ کی موت پر لکھتے ہیں:۔

''ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھو نہ بنو۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزدی کا شکر بجالاؤ۔ غم نہ کاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔''

طرح طرح سے غم زدوں کی دلجوئی کرتے ہیں۔ میاں داد خاں سیاح کا بیٹا مر گیا تو اپنی مثال سے دلاسا دیتے ہیں کہ اکہتر برس کی عمر تک میرے سات بچے ہوئے ان میں سے کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ جیا۔ تفتہ کو کیسی پتے کی بات لکھتے ہیں کہ ''صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔''

یوسف مرزا کو تسلی دینے کا یہ انداز بھی دیکھیے :۔

''اے میری جان، اے میری آنکھیں،

زہجر انِ طفلی کہ در خاک رفت

چہ نامی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے اولاد بہت۔ نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟''

غالب نے ایسے تعزیت نامے بھی لکھے جن میں ظرافت سے کام لیا اور ایسے بھی کہ پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ غم سے پرسا دینے والے کا کلیجا پھٹا پڑ رہا ہے۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :۔

''یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔''

نواب امین الدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس موقعے پر غالب نے انھیں جو تعزیتی خط لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ رسمی باتیں بھی آ گئیں اور دلی کیفیت کا اظہار بھی ہو گیا۔ دیکھیے :۔

''بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہارِ غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے

ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلتِ نواب مغور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقعے پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت تو میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔''

خودسوانحی عنصر:

مکاتیب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ مکتوب نگار کی سوانح سے متعلق سب سے معتبر مواد اسی صنف میں ملتا ہے۔ مکتوب نگاری سے غالب کو خاص رغبت تھی۔ ابتدائی زندگی سے قطعِ نظر ان کا سارا سارا دن اسی شغل میں بسر ہوتا تھا۔ ان کی زندگی کے جملہ حالات اور سارے واقعات ان خطوں میں بیان ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی باقاعدہ سوانح عمری تو نہیں لکھی لیکن ان خطوں سے سوانحی اقتباسات چن کر ترتیب دے دیے جائیں تو غالب کی خودنوشت تیار ہو جاتی ہے۔ کئی اہل قلم نے یہ خدمت انجام دی بھی ہے۔

غالب اپنے خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، میرا دادا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آیا اور فوج میں نوکر ہوا۔ آگے چل کر میرا باپ عبد اللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کی سرکار میں پھر حیدرآباد جا کر نظام علی خاں کے یہاں اور اس کے بعد الور جا کے راجا بختاور سنگھ کی نوکری کی۔ وہاں لڑائی میں مارا گیا۔ میرا چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبیدار تھا۔ اس نے پالا۔ میں آٹھ برس کا تھا کہ وہ بھی مر گیا۔ میری تنخواہ مقرر ہوئی۔ بعد غدر اس جرم میں پنشن بند ہو گئی کہ تم بہادر شاہ کے مصاحب تھے۔ تین برس کی چھان بین کے بعد یہ بحال ہوئی۔

یہ تو ابتدائی زمانے کے حالات تھے۔ بعد کے حالات مختلف خطوں میں تحریر ہوتے رہے۔ شراب نوشی کا ذکر، ایک ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھنے کا ذکر ان کے خطوں میں موجود ہے۔ باتوں کو صیغۂ راز

میں رکھنا ان کی عادت نہیں۔ مصلحتاً کہیں جھوٹ بولتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سچ بات بھی بتا دیتے ہیں۔ لوگ بے استاد نہ کہیں اس لیے ملا عبد الصمد ہرمزد نام کا ایک استاد اپنے دماغ سے وضع کرلیا۔ آگے چل کر اعتراف بھی کرلیا کہ یہ سب میرے ذہن کی پیداوار ہے۔

زندگی کے آخری ایام آلام و مصائب میں بسر ہوئے۔ بیماری، تنگدستی اور ناقدری نے بہت تکلیف پہنچائی۔ خطوں میں جابجا ان تینوں تکلیفوں کا ذکر ہے۔ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں:۔

''قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے؟ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوحِ جدید کا آرزومند پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سوان کے یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپے دیتے ہیں، نہ جواب، نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔''

چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

''پایانِ عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رامپور کے ساٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امور عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔''

''میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔۔۔۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر کیوں جیتا ہوں؟ روح میری جسم میں اب اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں! کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت!''

☆

''ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر، نہ دنیا میں توقع نہ عقبی کی امید۔ میں ہوں اور اندوہِ ناکامیِ جاوید۔۔۔۔۔۔ ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ اب اور کہاں تک رہوں گا؟ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا۔ تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔اب اور کیا کہوں گا؟ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔''

☆

''مجھے اپنی ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد بہ اندازۂ بالیست نہ پائی۔آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔قلندری آزادگی و ایثار وکرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدرِ ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں ہوں اس شہر میں تو ننگا بھوکا نظر نہ آئے۔۔۔۔۔۔۔میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطعِ نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔''

دہلی کے حالات:

عہد غالب کی دہلی کو اور وہاں پیش آنے والے واقعات کو ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ان واقعات نے وقت کے دھارے کا رخ موڑ دیا اور تحریک آزادی کا راستہ ہموار کر دیا۔

مغل سلطنت کا سورج غالب کی آنکھوں کے آگے ڈوبا۔ انگریزوں کے اقبال کی صبح ان کی نظروں کے سامنے طلوع ہوئی۔ انھوں نے سب کچھ دیکھا، بہت کچھ جھیلا بھی۔ غالب بہت سمجھ دار انسان تھے۔ مصلحت کا دامن انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ چاہتے تو ۱۸۵۷ء کی قیامت کا آنکھوں دیکھا حال پوری تفصیل کے ساتھ لکھ سکتے تھے مگر جانتے تھے اس میں جان کا خطرہ ہے۔ تفتہ کے نام خط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ''مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں'' پھر بھی ان خطوں میں نہایت اہم معلومات محفوظ ہوگئی ہیں۔

۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں۔ امیر غریب سب (دہلی سے) نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست (یعنی سزا) پاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست (مارشل لا) ۱۱رمئی سے آج تک یعنی پنجم دسمبر تک بدستور ہے۔ باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ (اجازت نامہ) اندر نہیں آنے پاتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے جاگیردار پکڑے ہوئے ہیں، بڑے بڑے رئیس پابہ زنجیر دہلی لاکر زنداں میں ڈالے گئے۔ بڑے دکھ کے ساتھ لکھتے ہیں۔

> ''واللہ ڈھونڈے مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔''

خود غالب بھی باز پرس سے نہیں بچے۔ پہلے تو ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم نے سکہ کہا۔ مطلب یہ کہ بہادر شاہ کی تاج پوشی پر شعر کہے۔ آخر کار اس الزام سے بری ہوئے۔ پنشن اس جرم میں بند ہوئی کہ تم بادشاہ کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ بالآخر پنشن بحال ہوئی۔ غالب نے لکھا ہے کہ انگریز افسروں کی عدالتیں من مانی کرتی تھیں۔ کوئی قانون قاعدہ نہ تھا جسے چاہا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جسے چاہا بخش دیا۔

نہ لکھنے پر بھی غالب نے ۱۸۵۷ء کے بارے میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ یہاں اس کا نمو

پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔اس زمانے میں غالب کو سب سے بڑا غم تنہائی کا تھا۔بہت سے دوست اور عزیز مر گئے۔جو زندہ تھے وہ ان سے اور ان کی دلی سے دور تھے۔غالب انھیں برابر یاد کرتے تھے اور خطوط میں بڑے درد آمیز انداز میں ان کا ذکر کرتے تھے۔میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:۔

''وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گئے ہیں۔اللہ اللہ اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟''

وہ ایک انسان دوست ہیں کہ اپنوں بیگانوں سب کے غم میں شریک ہیں انھیں صرف اپنے ہم وطنوں کی موت کا غم نہیں انگریزوں کی موت پر بھی وہ سوگوار نظر آتے ہیں:۔

''انگریز کی قوم سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست، کچھ معشوق، سب کے سب خاک میں مل گئے۔ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ہائے، اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔''

غالب کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں دہلی پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی اور وہاں کے رہنے والوں پر کیا گزری تھی۔چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کی نظر سے نہیں بچیں۔دکانوں کا منہدم ہونا، کنووں کا بند کیا جانا، سڑکوں کا چوڑا ہونا سبھی کچھ انھوں نے لکھ دیا ہے لیکن انگریزوں کے مظالم کی داستان پوری طرح بیان نہیں ہوئی۔داد گیر کا خوف نہ ہوتا تو، ۱۸۵۷ء کی دہلی کا حال ان سے بہتر کوئی

اور نہیں لکھ سکتا تھا۔

اوپر جن خصوصیات کا ذکر ہوا بے شک انھوں نے خطوطِ غالب کو ہماری زبان کے نثری ادب میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا لیکن وہ شے جس نے انھیں اردو ادب کا لافانی شاہکار بنا دیا وہ مکتوب نگار کا حسنِ بیان ہے اور اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو ضروری ہے۔

1.7 حسنِ بیان:

خطوط غالب میں ایک نہیں نثر کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔ اور ہر ایک ایسا جاذب نظر کہ بار بار پڑھیے اور لطف لیجیے۔ کہیں سادہ وسہل اسلوب اختیار کرتے ہیں، کہیں رنگینی ورعنائی سے بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ استعارہ وتشبیہہ کا استعمال کرتے ہیں۔ کسی خط میں مقفی عبارت نظر آتی ہے۔ کہیں خالص علمی نثر ہے، کہیں استدلالی انداز اپنایا گیا ہے۔ کہیں افسانے کا رنگ ہے تو کہیں ڈرامے کا۔ ذیل میں ان خصوصیات پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

سادگی:

سادگی کا اپنا ایک حسن ہے۔ کبھی کبھی سادگی ایسی پرکشش ہوتی ہے کہ ہزار بناؤ سنگھار اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ غالب کا طریقہ یہ تھا کہ قلم اٹھایا اور خط لکھنا شروع کر دیا۔ نہ موضوع کی تلاش، نہ لفظ کی جستجو۔ کوئی معمولی قلمکار ہو تو اندیشہ ہے کہ بے مزہ پھسپھسی نثر وجود میں آئے لیکن مصنف زبان پر قدرت رکھتا ہو تو اس کا اندیشہ نہیں۔ غالب کا یہی معاملہ ہے۔ ان کی قلم برداشتہ نثر بھی ایسی دل کش ہے کہ معمولی درجے کا مصنف ہزار بار صیقل کرنے اور نوک پلک سنوارنے کے باوجود ایسی نثر لکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ ایک خط میں مکتوب الیہ کو دعا دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ''تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مرجاؤں'' دعا بے اختیار دل سے نکلتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ یوسف مرزا کے نام تعزیت نامہ اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''خزانے سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں

پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی، حاسدوں کو موت آ گئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔''

اس عبارت پر غور کیجئے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ انھیں پڑھیے تو خوش آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا مکمل سمفنی ہے۔ نظم وہ کامیاب ہے جسے گایا جا سکے اور نثر وہ کامیاب ہے جسے اونچی آواز میں پڑھیے تو کانوں کو اچھی لگے اور لطف حاصل ہو۔

علاء الدین علائی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انھوں نے غالب سے تاریخی نام کی فرمائش کی۔ غالب نے جواب میں لکھا کہ میں نے اپنے بیٹے کا تاریخی نام نظم کر دیا تھا۔ وہ مر گیا۔ یہ میری نحوست نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کہہ کر تاریخی نام نکالنے کو منع کر دیا۔ ممکن ہے کہ یہ بہانہ ہو مگر دلیلیں ایسی ہیں کہ قایل ہونا پڑتا ہے۔ انداز شگفتہ ہے اور اس شگفتگی کی تہہ میں ہلکی سی ظرافت کارفرما ہے جس سے ذہن لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس سادگی میں بھی بڑی دلکشی ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے اصل عبارت:۔

''شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخن ور ہو گئے حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غم زدہ دل کو تکلیف دو؟ علاء الدین خاں! تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین خاں حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی

ڈھونڈوں گا۔حق تعالی تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔''

رنگینی:

غالب شاعر ہیں اور نثر میں بھی حسبِ ضرورت شعری وسائل کا سہارا لیتے ہیں۔کہیں استعارہ و تشبیہ سے کام لیتے ہیں کہیں پیکر تراشی سے۔قافیہ آرائی کی مثالیں بھی بے شمار ہیں۔رعایت لفظی کے استعمال سے بھی نہیں چوکتے لیکن اس صنعت کے استعمال میں وہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔گویا ان خطوط میں سادگی و رنگینی کا دلکشی امتزاج نظر آتا ہے۔قابلِ ذکر بات یہ کہ کہیں تصنع یعنی بناوٹ کا گمان بھی نہیں گزرتا۔

زندگی کے آخری ایام ہیں۔زندگی کا سورج ڈوبنے کو ہے۔اس وقت ایک خط میں اپنے لیے ''چراغِ دم صبح'' اور ''آفتاب سرِ کوہ'' کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق کو لکھتے ہیں:۔

''نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔اللہ اللہ، دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے۔دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔

عمر بھر دیکھا کیئے مرنے کی راہ
مرگئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

''دریا سارا تیر چکا ہوں'' کا مطلب ہے کہ ساری زندگی گزار چکا ہوں۔''ساحل نزدیک ہے۔'' سے مراد یہ کہ موت کے دن دور نہیں۔''بیڑا پار ہے'' یعنی جلد موت کی آغوش میں جا سوؤں گا۔یہ سب استعاراتی انداز بیان ہے۔

میاں داد خاں سیاح کے نام ایک خط میں اسی استعاراتی انداز میں اپنے بڑھاپے اور بیماری کا

ذکر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے یہ خط کیسی تاثیر سے لبریز ہے:۔

''ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف ہستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادراہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا گیا تو خیر ورنہ دوزخِ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

رکاب میں پاؤں، باگ پر ہاتھ، سفر دور دراز، زادِ راہ خالی ہاتھ، یہ سب استعارے ہیں۔۔۔۔سادہ اور سہل مگر بے حد دلکش!

''حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں ایک قدم آدم دیوار اٹھے۔''

یہاں آہستہ آہستہ اٹھنے کو قد آدم کی اونچائی تک دیوار تعمیر ہونے سے تشبیہ دی ہے۔ غالب کے زمانے میں چھوٹی اینٹوں کا استعمال ہوتا تھا جو لکھوری اینٹیں کہلاتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ دیوار چننے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ کیسی مکمل تشبیہ ہے۔

''حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا'' یہاں قافیے کا اہتمام کیا ہے جو لطف دے رہا ہے۔

مرزا تفتہ کا دیوان ''سنبلستان'' شائع ہوا۔ انھوں نے ایک جلد استاد کی نذر کی۔ غالب کو کتابت وطباعت پسند نہ آئی۔ انھیں رمز یہ انداز میں لکھتے ہیں:۔

''اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے۔ بیگماتِ قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔

صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستاں ایک معشوق خوب رو ہے مگر بدلباس۔''

اس کتاب کو معشوق خوب رو مگر بدلباس اس لیے کہا کہ کلام عمدہ ہے مگر جس کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شایع ہوئی وہ خراب ہے۔ یہ استعارہ ہوا۔ اس کتاب کو قلعے کی بیگمات سے تشبیہ دی گئی کیوں کہ وہ ہیں تو خوبصورت مگر لباس خراب وخستہ ہے۔ جوتیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔

مرقع کشی:

شاعر لفظوں سے اپنے کلام میں کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ یہ شاعری کا بہت بڑا کمال ہے۔ اس کمال کا مظاہرہ نثر نگاری میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے ان خطوں میں جہاں اور شعری تدبیروں سے کام لیا ہے وہیں تصویر کشی کا کمال بھی دکھایا ہے۔ اس کی اچھی مثال ایک تو وہ خط ہے جس مین سرفراز حسین کو لکھتے ہیں کہ ''وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔'' تصور کا عالم ہے۔ ایک ایک دوست کو آتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

ایک خط میں اپنی مضحکہ خیز تصویر ان لفظوں میں کھینچتے ہیں۔ مضحکہ خیز تو کیا اسے دردناک کہنا چاہیے۔

''آیئے نجم الدولہ بہادر۔ ایک قرضدار کا گریباں میں ہاتھ۔ ایک بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟''

میر مہدی کے نام ایک خط میں ان کے ایک دوست کی لفظوں میں ایسی تصویر کھینچتے ہیں لگتا ہے کہ وہ جیتے جاگتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوئے:۔

''کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، داڑھی

منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمھارا خط دیا صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا حکیم نکلے یعنی حکیم میر اشرف علی۔ ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔"

قافیہ آرائی:

قافیے کا اصل تعلق تو شاعری سے ہے لیکن نثر میں بھی اس سے کام لیا جاتا رہا ہے بلکہ ہمارے قدیم نثر نگاروں نے قافیہ بندی کو ہی نثر نگاری کا کمال سمجھ لیا اور مقفیٰ عبارت کا دور دورہ ہو گیا۔ مقفیٰ کا مطلب ہے وہ عبارت جس میں قوافی کا اہتمام کیا گیا ہو مقفیٰ عبارت کا لکھنا ہی کچھ کم دشوار نہ تھا کہ اس پر مسجع کی شرط بھی لگادی گئی۔ سجع کے معنی ہیں وزن۔ جس عبارت کے کے فقروں میں وزن یعنی سجع کا اہتمام کیا جائے وہ مسجع کہلاتی ہے۔ مثلاً:

"مشفق و مہربان، نواب کلبِ علی خاں کو غالب نیم جان کا سلام قبول ہو۔"

اس قافیہ پیمائی نے نثر نگاری کو ایک مشکل فن بنا دیا۔ مطلب یہ کہ نثر میں کچھ لکھو تو مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھو اور یہ کام بس کا نہ ہو تو نثر نگاری سے دور رہو۔ غالب تو شاعری کو بھی قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی کہتے ہیں۔ وہ اسے نثر کا زیور کیسے سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے اسے ترک کر کے صاف، سادہ اور سلیس زبان میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا۔ ان خطوں میں جا بجا مقفیٰ، عبارتیں ملتی ہیں مگر کہیں تفریحاً کہیں مکتوب الیہ کو خوش کرنے کے لیے اور کہیں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دیکھو ہم اس فن میں بھی طاق ہیں۔ یہ استعمال ایسا ہے کہ اکثر لطف دیتا ہے۔ اسی لیے یہاں ہم نے عنوان قافیہ پیمائی نہیں بلکہ قافیہ آرائی رکھا ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں قوافی سے اپنی نثر کو سجایا ہے۔ دو چار فقرے مقفیٰ لکھے اور سہل

نگاری کے اپنے مخصوص انداز میں خط کو مکمل کر دیا۔ یہاں قافیہ آرائی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

''اہاہاہا، میرا پیارا مہدی آیا۔ مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رامپور ہے، دارلسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔''

☆

''ہزار دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔''

تفتہ کو لکھتے ہیں:

''رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے مگر چونکہ تحکم وکارفرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ہوئے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور چار جلدیں یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔''

چند اور مثالیں:

''نہ تم مجرم نہ میں گنہ گار، تم مجبور میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سر گزشت میری زبانی سنو۔''

☆

''خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔''

☆

''بھائی یہاں کا نقشہ کچھ اور ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔''

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے قافیوں کا استعمال تو کیا مگر اپنے انداز سے۔ تھوڑا

بہت منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دو چار سطریں اس طرح کی لکھیں پھر اپنے اصل رنگ پر آ گئے۔ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے کہ ہر میدان میں اپنا راستہ سب سے الگ نکالتے ہیں۔

افسانویت:

بعض خطوں میں غالب نے افسانوی انداز اختیار کیا ہے۔اس کی مثالیں کم ہیں مگر ہیں بہت دلکش، کئی جگہ واقعات بالکل اس طرح سنائے ہیں جیسے کوئی کہانی سنا رہے ہوں۔ایک خط میں اپنی زندگی کی پوری کہانی بیان کی ہے۔اس کہانی میں شروع سے آخر تک استعارہ و علامت کا استعمال کیا گیا ہے۔ علاءالدین علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔، چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقتِ مقرری اور مشکل ہوگئی۔بے حیا ہوں سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ کر مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔پھر پکڑا آیا۔اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔''

یہاں بیڑی سے مراد بیوی ہے۔ عارف کے دو بیٹے غالب کے ساتھ رہتے تھے، انھیں، ہتھکڑیاں کہا ہے۔اس خط میں متعدد علامتوں کا استعمال ہوا ہے جو ذرا سا غور کرنے سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔اسے تمثیلی انداز کہنا مناسب ہوگا۔

ڈرامائیت:

غالب کے خطوط میں جا بجا ڈرامائی انداز نظر آتا ہے۔بعض مکاتیب تو مکمل ڈراما ہیں۔مکتوب نگار کا یہ دعویٰ کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے بالکل درست ہے۔خطوطِ غالب میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ بہت سے خطوط کا آغاز ہی ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے۔مکتوب الیہ کو اکثر اس طرح مخاطب کرتے ہیں جیسے اسے آواز دے کر بلاتے ہیں یا بلواتے ہیں۔جیسے:۔

> ''ارے کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔۔۔۔۔لو صاحب وہ آئے۔''

میر مہدی مجروح کے نام غالب کا خط جو اس طرح شروع ہوتا ہے جیسے:

> ''میرن صاحب سے محوِ کلام ہوں اور گماں گزرتا ہے کہ یہ خط میرن صاحب کے نام ہے اس کی بہترین مثال ہے۔اس خط کا پہلا جملہ ''اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم۔''

یہاں دو اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ غالب فرماتے ہیں کہ محمد علی بیگ آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں یا ابھی نہیں:۔

''بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟''

''حضرت ابھی نہیں۔''

''کیا آج نہ جائیں گی؟''

''آج ضرور جائیں گی۔تیاری ہو رہی ہے۔''

نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

''پیر جی سے جب پوچھتا ہوں : تم خوب شخص ہو؟

اور وہ کہتے ہیں : کیا کہنا ہے

میں پوچھتا ہوں : کس کا؟

تو وہ فرماتے ہیں : مرزا شمشاد علی بیگ کا۔''

ایں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے ؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہیرا سنگھ موجود ہے۔

واہ صاحب، میں کیا خوشامدی ہوں جو منھ دیکھی کہوں۔''

1.8 علمی نثر:

اردو نثر کے فروغ میں تین بزرگوں کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ یہ ہیں میر امن، ۔غالب اور سر سید۔ یہ خیال عام ہے کہ میر امن کی نثر قصہ کہانی سنانے سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غالب کی زبان خیریت گوئی اور عافیت جوئی کے سوا اور کسی کام نہیں آ سکتی۔ علمی نثر کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا سر سید کے سر ہے، مگر یہ خیال درست نہیں۔ غالب کے خطوط میں ہر طرح کی نثر کے اولین نقوش نظر آ جاتے ہیں۔

علمی نثر سے مراد وہ زبان ہے جس میں ہر طرح کے علمی مضامین ادا کیے جا سکیں اور ہر طرح کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جا سکے۔ خطوط غالب میں علمی نثر کی مثالیں جگہ جگہ موجود ہیں۔ انھوں نے بہت سے خطوط میں علمی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ ایسے موقعوں پر علمی نثر وجود میں آئی۔ اپنے متعدد اشعار کی وضاحت کی ہے اور ان کی باریکیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

اس شعر کی بابت لکھتے ہیں :۔

”مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں۔ داد دینا حسنِ عارض اور حسنِ ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اسکا صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیرِ غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے؟ حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ ہوسناک آدمی تھا۔ اگر پاے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔“

یہ خالص علمی نثر کا نمونہ ہے۔

استدلالی نثر:

استدلالی نثر علمی نثر کا ہی ایک روپ ہے۔ مراد یہ کہ جو دعوی کیا جائے اسے دلیلوں سے ثابت کردیا جائے۔ اسے استدلالی نثر کہتے ہیں۔ سرسید نے اس سے بہت کام لیا۔ اپنی رائے کی تائید میں انھیں بار بار دلیلیں پیش کرنی پڑیں۔ اس لیے استدلالی نثر کا موجد انھیں ہی سمجھا جائے گا۔ اس نثر کو عام کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا نقش اول پہلی بار غالب کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ خط پیش کیا جاسکتا ہے جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے نام لکھا گیا ہے۔ غالب ان سے دیوان مستعار مانگتے ہیں اور دلیلیں دیتے ہیں کہ تمھارے لیے اس کا دینا کیوں مناسب ہے۔ پھر طرح طرح یقین دلاتے ہیں کہ اسے واپس کردیا جائے گا۔ غالب کی دلیلیں ملاحظہ ہوں:

”آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے

بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟

رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی اور لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟

اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضّل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ تیسرے یہ کہ سراسر غلط ہر شعر غلط۔ ہر مصرع غلط

''یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔''

پورے خط میں دلیلیں موجود ہیں۔ پہلے پیرگراف پر غور کیجئے۔ دیوان نہ دینے کا سبب پوچھتے ہیں۔ کہتے ہیں ایسا تو نہیں کہ روز آپ کے مطالعے میں رہتا ہو اور اسے دیکھے بغیر آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو۔ پھر دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں کہ اس کا چھپنا بہر حال مفید ہے۔ ایک جلد کی ہزار جلدیں بن جائیں گی میرا کلام ہر طرف مشہور ہوگا۔ اس سے مجھے خوشی ہوگی۔ تمھاری تعریف میں جو قصیدہ میں نے کہا ہے اسے دنیا دیکھے گی۔ اس طرح دلیلوں سے مکتوب الیہ کو قایل کر دیتے ہیں کہ دیوان مستعار دینے میں اس کا کوئی نقصان نہیں بلکہ ہر طرح فائدہ ہی ہے۔ خطوط غالب میں استدلالی نثر کے نمونے دو ایک جگہ اور بھی نظر آتے ہیں۔ اردو میں اس انداز نظر کے نقاش اول بلا شبہ غالب ہیں۔ اسے فروغ دینے اور عام کرنے کا سہرا بے شک سر سید کے سر ہے۔

غالب کے خطوط ہمارے ادب کا لافانی شاہکار ہیں۔ صرف وہی ادب پارہ شہکار کہلانے کا مستحق ہے جس پر کم ایک صدی گزر چکی ہو اور اس کی مقبولیت میں کمی نہ آئی ہو۔ کتابیں اپنی تخلیق کے کافی بعد قارئین تک پہنچتی ہیں اور ان کی پسند و ناپسند کی کسوٹی پر کسی جاتی ہیں۔ خط خواہ اہم ہو یا غیر اہم، کم

سے کم ایک قاری یعنی مکتوب الیہ تک بلا تاخیر پہنچ جاتا ہے اور اس پر قاری کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی مہر لگ جاتی ہے۔ غالب کا خط جب کسی مکتوب الیہ تک پہنچتا تھا تو وہ اسے ایک انمول سوغات سمجھ کر آنکھوں سے لگاتا تھا۔ عزیزوں دوستوں کو دکھاتا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کرتا تھا۔ غالب کے خطوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہ مقبولیت آج تک برقرار ہے۔ اس کے باوجود بعض علمائے ادب کو شکایت ہے کہ یہ خطوط جتنی توجہ کے مستحق تھے اتنی توجہ ان کی طرف نہیں کی گئی۔

مولانا غلام رسول مہر کا ارشاد ہے کہ غالب کے اردو خطوط اعلی درجے کی نثر نگاری کا ذوق پیدا کرنے میں بے حد معاون ہو سکتے تھے کیوں کہ ان میں ہر طرف اور ہر رنگ کی تحریریں موجود تھیں مگر ان سے وہ کام نہیں لیا گیا جو لیا جاسکتا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

> ''تعجب ہے کہ انھیں رسمی خطوط سمجھ لیا گیا اور اس لحاظ سے نہ دیکھا گیا کہ ان میں صحیح مذاقِ نگارش کی پرورش کے کتنے جوہر موجود ہیں۔ وہ اگر محفوظ رہے تو زیادہ تر اس لیے کہ ایک باکمال اور شہرۂ آفاق شاعر کے تبرکات تھے اس لیے نہیں کہ بجائے خود محفوظ رہنے اور فروغ پانے کے حقدار تھے۔''

پروفیسر آلِ احمد سرور کا ارشاد ہے:۔

> ''غالب کے خطوط سے جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔۔۔۔ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ خواہ شبلی ہوں یا ابوالکلام غالب کے خطوں کا جواب اب تک نہ ہوسکا۔''

جدید اردو نثر کی تشکیل میں میرامن کے بعد دوسرا اہم نام غالب کا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی فرومایہ زبان کو جو قصہ کہانی سنانے پر بھی پوری طرح قادر نہ تھی ایسی توانائی عطا کی کہ وہ پیچیدہ خیالات ادا

کرنے اور مشکل علمی موضوعات پر اظہار خیال کرنے کے قابل ہوگئی۔ کچھ ہی دنوں بعد سرسید کے قلم نے اس زبان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی ہم سری کر سکے۔

اردو زبان کو فروغ دینے کے علاوہ ان خطوط کا یہ کارنامہ کچھ کم اہم نہیں کہ ایک شہرۂ آفاق شاعر کی رنگا رنگ شخصیت ان صفحات میں سمٹ آئی ہے۔ سچ کہا گیا ہے کہ شاعری شخصیت کا اظہار نہیں، اس سے فرار ہے۔ مطلب یہ کہ شعر شاعر کے چہرے پر نقاب ڈال دیتا ہے اسے اٹھاتا نہیں۔ خط ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو اس نقاب کو ہٹا سکتا ہے۔ یہ خطوط نہ ہوتے تو غالب کی پہلودار اور پر پیچ شخصیت کبھی ہم پر منکشف نہ ہوتی۔ ان خطوط کی یہ خصوصیت بھی نہایت اہم ہے کہ ان میں غالب کا عہد، عہد غالب کی دم توڑتی ہوئی تہذیب، اس تہذیب کی راکھ سے جنم لیتی ہوئی ایک نئی دنیا اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہے۔

یہ خطوط ہمارے لیے سرمایۂ انبساط بھی ہیں اور ذخیرہ معلومات بھی۔

☆☆☆

1.9 خطوط غالب کے چند نمونے

ا۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں ہنستے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب، دس دس بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار، ۲۷؍دسمبر ۱۸۵۸ئ　　　　غالب

۲۔امین الدین خان کی والدہ کے انتقال پر

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔اظہارِ غم،تلقین صبر،دعاے مغفرت۔سو بھائی اظہارِ غم تکلفِ محض ہے۔جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔تلقینِ صبر بے دردی ہے۔رہی دعائے مغفرت تو میں کیا اور میری دعا کیا؟ لیکن چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں،دل سے دعا نکلتی ہے۔

غالب

۳۔منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

اجی مرزا تفتہ!

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ہائے کیا بری کاپی ہے۔اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے۔بیگماتِ قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے،پائنچے لیر لیر،جوتی ٹوٹی۔یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوب رو ہے،بدلباس۔

بہر حال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔چنانچہ آج سے شروع ہوگیا۔

مرقومہ صبح سہ شنبہ ۱۹/ماہِ اپریل ۱۸۶۱ء　　　　غالب

۴۔بنام نواب ضیاء الدین خاں

جنابِ قبلہ وکعبہ،

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔بغیر اس کے

دیکھے آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟

رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی اور لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟

اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضّل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمھارا نقصان کچھ نہیں۔

ہاں احتمالِ نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم۔ اس صورت میں تلافی کا کفیل جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور جب طلب اس کی دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔

رحم و کرم کا طالب

غالب

۵۔علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

مولانا نسیمی،

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں ۔تم سخن ور ہو گئے حسنِ طبعِ خداداد رکھتے ہو۔ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرِ غم زدہ دل کو تکلیف دو؟ علاء الدین خاں ! تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی ۔ میرا ممدوح جیتا نہیں ۔نصیر الدین خاں حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے ، پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔حق تعالی تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے۔ وہ عمر کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب،تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوطِ فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے۔صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوں کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں ، نہ سہی۔ اہلِ حرفہ سے بھی نہیں

ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتانہ پائے۔آپ صرف دہلی اور میرا نام لکھ دیا کیجیے خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

پنجشنبہ ۴ / ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

غالب

1.10

نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ خطوط غالب کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ خطوط غالب کی روشنی میں ان کے مزاح اور ڈرامائی عنصر کی نشان دہی کیجیے۔

۳۔ غالب کے تعزیتی خطوط کے مخصوص انداز پر تبصرہ کیجیے۔

۴۔ غالب کے خطوط کے مجموعوں کے بارے میں اپنی معلومات سپرد قلم کیجیے۔

اکائی نمبر:2 مضامین سرسید

ساخت:

2.0 اغراض ومقاصد
2.1 تمہید
2.2 سرسید کے سوانحی حالات
2.3 سرسید کے عہد کا مذہبی وسیاسی پس منظر
2.4 سرسید کی مضمون نگاری کی خصوصیات
2.5 مضمون 'امید کی خوشی' کا خلاصہ
2.6 مضمون 'تعلیم وتربیت' کا خلاصہ
2.7 مضمون 'رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات' کا خلاصہ
2.8 مضمون 'اخلاق' کا خلاصہ
2.9 مضمون 'کاہلی' کا خلاصہ
2.10 مضمون 'ریا' کا خلاصہ
2.11 مضمون 'تکمیل' کا خلاصہ
2.12 مضمون 'خوشامد' کا متن
2.13 نمونہ امتحانی سوالات

2.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ سرسید کے سوانحی حالات سے واقف ہو سکیں۔
☆ سرسید کے عہد کے مذہبی، سیاسی پس منظر کی جانکاری حاصل کر سکیں۔
☆ سرسید کے مضمون نگاری کے خصوصیات کا جائزہ لے سکیں۔
☆ سرسید کے مضامین کا خلاصہ بیان کر سکیں۔

2.1 تمہید:

اس اکائی میں ہم سرسید کے سوانحی حالات کی جانکاری دیتے ہوئے سرسید کے عہد کے سیاسی و مذہبی پس منظر کا جائزہ لیں گے۔ مضامین سرسید کے بارے میں آپ کو معلومات فراہم کریں گے اور یہ بھی بتائیں گے کہ سرسید کی مضمون نگاری کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ ان خصوصیات کی روشنی میں ہم اردو نثر میں سرسید کا مقام و مرتبہ متعین کریں گے۔ اس اکائی کے تحت ہم مضامین سرسید کا نہ صرف تعارف کرائیں گے بلکہ ہر مضمون کا انفرادی خلاصہ اور مفہوم بھی بیان کریں گے۔ آخر میں سرسید اور مضامین سرسید سے متعلق نمونہ امتحانی سوالات دیے گائیں گے جو آپ کے لئے جوابات کی تحریر میں معاون ثابت ہوں گے۔

2.2 سرسید کے سوانحی حالات

سرسید احمد خان ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان دلی کے ممتاز خاندانوں میں سے تھا۔ سرسید کے ننھیال کا تعلق اردو کے مشہور شاعر خواجہ میر درد کے خاندان سے تھا ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں صاحب علم اور ذی فہم تھے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے دور میں عہدہ وزارت پر مامور تھے اور سفیر بنا کر بھی بھیجے گئے۔ خواجہ فریدالدین احمد کی تین بیٹیوں میں عزیز النساء سب سے بڑی تھیں ان کے گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا سب بھائی بہن تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ عزیز النساء کو عربی و فارسی اور اردو کی گھریلو تعلیم دی گئی وہ نہایت خوش سلیقہ تعلیم یافتہ خاتون تھین ان کی شادی میر متقی سے ہوئی ان کے یہاں ایک لڑکی اور دو بیٹے ہوئے۔ بڑے کا نام سید محمد رکھا گیا اور چھوٹے سید احمد کہلائے۔

سرسید کے آباء واجداد ہرات سے اکبر اول کے عہد میں ہندوستان آئے تھے اور تقریباً دوسو پچاس برس تک مغلیہ حکومت کی خدمات انجام دیتے ہوئے دربار مغلیہ سے وابستہ رہے۔ سید ہادی جو سرسید کے دادا تھے انہیں ۱۷۵۴ء میں شاہ عالم گیر ثانی نے جواد علی خان کا خطاب عطا کیا۔ بعد میں شاہ

عالم نے انہیں مزید خطابات کے ساتھ قاضی لشکر اور عہدۂ احتساب کی خدمت سپرد کی۔ سید ہادی کے بیٹے اور سرسید کے والد سید متقی اور بادشاہ کے روابط بڑے خوش گوار تھے اور بادشاہ انہیں بھائی متقی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ سید متقی چونکہ صوفی منش بزرگ تھے لہذا انہیں خانقاہ مظہری کے مشہور بزرگ شاہ غلام سے بڑی عقیدت تھی چنانچہ سرسید کی بسم اللہ خوانی حضرت شاہ غلام علی نے کرائی تھی۔ سرسید کو بھی حضرت شاہ غلام علی سے آخری عمر تک عقیدت وارادت حاصل تھی۔

سرسید کا بچپن اپنے نانا کے گھر کے امیرانہ ماحول میں گذرا۔ ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد ایک زبردست عالم تھے ان کے پاس ایک اچھا کتب خانہ بھی تھا جس سے سرسید وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے تھے۔ سرسید کی تربیت میں خواجہ فرید الدین اور سرسید کی والدہ کا نمایاں حصہ رہا ہے سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم ایک دوراندیش اور دردمندانہ خاتون تھیں انہی کے زیرسایہ سرسید نے کامل تربیت حاصل کی۔ سرسید کے والد کے انتقال کے بعد سرسید کی تعلیم کا سارا بوجھ ان کی والدہ پر پڑا۔ انہی کی تربیت تھی کہ جس نے سرسید کو اعلیٰ نصب العین کے لئے تلخ حقائق سے دوچار ہونے کا گُر سکھایا۔ سید احمد خاں ان کے نانا کی سوانح حیات ''سرسید فریدیہ'' کے نام سے لکھی اس کے مکالمے سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید کے فکروعمل پر ان کی والدہ کا کس حد تک اثر رہا۔

سرسید احمد خاں اپنے دور کے تمام علوم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ حتی الامکان ان کی تحصیل کی کوشش بھی کی۔ سرسید احمد خاں کو دلی کے فاضلوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا شرف بھی حاصل تھا اور وہ اپنی خاندانی وجاہت کے سبب دلی کی اونچی سوسائٹی میں قدرومنزلت رکھتے تھے اس لئے کہا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں کی شخصیت کی تعمیر اور مزاج کی استواری میں اس ماحول کا خاصا اثر رہا ہے وہ ہمہ وقت مطالعہ میں غرق رہنے لگے یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں ذوقؔ، غالبؔ، صہبائیؔ اور مومنؔ کی شاعری کا چرچا تھا۔ سرسید احمد خاں نے بھی ان مشاہیر سے کسب فیض حاصل کیا ماحول کے اثر سے خود بھی شعر کہنے لگے۔ ان کی شادی نقیب الاولیا خاندان کی بیٹی پاکیزہ بیگم عرف مبارک بیگم سے کردی گئی وہ ایک معزز علم پرور

گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ خود بھی پڑھی لکھی تھیں۔

۱۸۳۶ء میں سرسید احمد خاں کے والد سید متقی کا انتقال ہو گیا اس وقت سرسید احمد خاں کی عمر انیس سال کی تھی بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار تھے سرسید کے دادا کے تمام خطابات سرسید احمد خاں کو بخش دیے اور ساتھ ہی انہیں ''عارف جنگ'' کا مزید خطاب عطا کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں سے بھی مغل بادشاہ کے تعلقات خوش گوار تھے۔ لیکن سرسید کی بصیرت اور حقیقت پسندی نے دربار سے وابستہ رہنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے درباری نوکری سے وابستہ ہونے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے اپنے خالو صدر امین خلیل اللہ خاں کی اعانت دہلی کی کچہری میں کام سیکھنا شروع کیا اور جلد ہی خاصی واقفیت حاصل کر لی اور رفروی ۱۸۳۹ء میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر ہوئے دوران ملازمت انہوں نے فرائض منصبی کے علاوہ علمی سرگرمیاں بھی برابر جاری رکھیں۔ سرسید احمد خاں نے صرف کسب معاش پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے اشغال بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے اور کوئی نہ کوئی اعلیٰ خیال یا مشغلہ ان کی زندگی کا مقصد بنا رہا۔ ان کو اپنے دادھیال اور ننھیال سے لکھنے پڑھنے کا شوق وارثتاً ملا تھا جس کو انھوں نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ سرسید احمد خاں نے ایک رسالہ ''جام جم'' کے نام سے تصنیف کیا جو ۱۸۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں امیر تیمور اور بہادر شاہ ظفر تک بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔ فتح پور سیکری آنے کے بعد انھوں نے پہلا مذہبی رسالہ ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' ۱۸۴۲ء میں شائع کیا۔ یہاں کی رہائش کے متعلق حالیؔ نے لکھا کہ ''فتح پور سیکری میں جہاں اکبر کی خوابگاہ تھی حسن اتفاق سے وہی عالی شان مکان سرسید احمد خاں کو رہنے کو ملا تھا۔''

سرسید احمد خاں کی مشہور تصنیف ''آثار الصنادید'' جب ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اسے تحسین کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ مشہور مورخ گارساں دتاسی نے اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ملازمت کے دوران سرسید احمد خاں نے ''سرکشی ضلع بجنور''، ''اسباب بغاوت ہند''،

''قول متین''، ''تبین الکلام'' اور ''احکام طعام اہل کتاب'' وغیرہ لکھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ ملازمت کے دوران انہوں نے ''آئین اکبری'' کا مصور ایڈیشن شائع کیا اور ساتھ ہی ساتھ ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''تزکِ جہانگیری'' تدوین کی۔

سرسید احمد خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد انھیں کئی فائدے ہوئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے اہل فرنگ کی تہذیب کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا جس سے انھوں نے بعد میں بڑے بڑے کام کئے۔ اس ملازمت کا اثر تھا کہ جس نے ''آثار الصنادید'' کے دوسرے ایڈیشن اور ''آئین اکبری'' کی تصحیح میں نظر دید کی جسے سائنٹفک نقطۂ نظر کہتے ہیں۔ ''آئین اکبری'' میں انہوں نے مغربی آداب تحقیق کا پورا پورا استعمال کیا جو یقیناً انگریزوں کا اثر کہا جائے۔

''اسباب بغاوت ہند'' میں اس کے بعد ان کی دوسری تصانیف میں حقیقت پسندی کی جو جلوہ گری نظر آتی ہے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی دین ہے۔ سرسید احمد خاں کے یہاں مشرقی علوم کی بے مائیگی کا جو شکوہ ملتا ہے وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے اور غدر کے بعد سرسید احمد خاں جب ہمارے سامنے ایک قومی رہنما کی حیثیت سے آتے ہیں تو اس میں بھی مغربی اثرات کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۸۵۷ء میں جب سرسید احمد خاں بجنور میں تھے تو اس واقعہ سے دوچار ہوئے جس نے ہماری تاریخ پر گہرا اثر ڈالا جب انگریزوں نے غدر کے الزام میں بہت سے بے گناہ خاندانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہا تو صرف سرسید کی مداخلت سے وہ محفوظ رہے۔ سرسید احمد خاں کی خدمت کے اعتراف میں جب بجنور کے کلکٹر نے باغی امراء میں سے کسی کی ضبط شدہ جائیداد جس کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپئے سے زائد تھی سرسید احمد خاں کو دینے کی سفارش کی تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ایک جائداد جوان کے کسی ہم وطن کی ملکیت تھی اسے ان کا ضمیر قبول کرنے پر رضامند نہ ہوا اس زمانے میں انہوں نے اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا۔ انہیں اپنے ہم وطنوں سے محبت تھی لہذا سرسید احمد خاں نے کسی بھی قیمت پر آزمائش اور مصیبتوں سے گذرتے ہوئے ملک و قوم کی سالمیت کو برقرار رکھا۔

۱۸۶۳ء میں جب سرسید کا قیام غازی پور میں تھا تو انہوں نے ایک علمی انجمن ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے قیام کا خاکہ تیار کیا اس کام میں ان کے دوست کرنل گراہم بھی شریک تھے اس سائنٹفک سوسائٹی میں انگریزی کے مشہور علمی اور تاریخی کتابوں کا ترجمہ کر کے ہندوستانیوں کو جو غیر ملکی تعلیم سے ناواقف تھے جدید خیالات سے آشنا کیا اور یہی انجمن تھی جس نے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں باہمی ربط کی فضا تیار کی اس انجمن کے ذریعہ قوم کے جوہر قابل کی تربیت بھی ہوئی اور اس انجمن سے وہ اخبار بھی نکلا جس نے اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب قائم کیا۔ یہی وہ انجمن ہے جسے ہم اگر علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

سرسید احمد خاں کو اپنی زندگی میں مغربی ممالک کے سفر کا موقع نصیب ہوا یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ سرسید بنارس میں تھے اور ان کے دوست سید محمود کو ولایت جانے کے لئے وظیفہ ملا۔ سرسید کو ایک بہانہ ہاتھ آیا اور انہوں نے بھی انگلستان جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے وہ سید محمود کے ساتھ عازم انگلستان ہوئے۔

سرسید احمد خاں کے سفر انگلستان کا مقصد یہ تھا کہ خود وہاں کے طور طریق، رسم و رواج، اخلاق و عادات اور علمی و سیاسی معاملات کا جائزہ لیں اور ساتھ ہی ساتھ سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' کا تنقیدی جواب لکھیں۔ انہوں نے لندن میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں کئی ماہ تک تفتیش و تحقیق اور کتب گردانی کی۔ مصر، فرانس اور جرمنی سے عربی کتابیں منگوائیں لاطینی اور انگریزی کی نایاب کتابیں حاصل کیں۔ محسن الملک سے حدیث و آیات کے سلسلے میں استفسارات کئے اور شب و روز کی مسلسل محنت کے بعد ''خطبات احمدیہ'' کا مسودہ تیار کیا اور اس کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ اس کتاب کی تکمیل کے بعد سرسید نے انگلستان میں خاصا معروف وقت گذارا یہاں انھوں نے ''مدرسۃ العلوم'' کا خاکہ تیار کیا اور مسلمانوں کی اصلاح خیالات کے لئے ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء کا پروگرام بنایا۔ ''تہذیب الاخلاق'' دراصل سرسید کا وہ رسالہ ہے جس میں انہوں نے ایسے مضامین شائع کئے جو

مسلمانوں کے دلوں میں جدید تعلیم کی طرف سے جو تنفر ہے اسے دور کیا جائے اس رسالے کی مدد سے مسلمانوں کو نئے علوم کی برکات کا احساس دلایا گیا اوران مقاصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی درس گاہ کا منصوبہ عمل میں آیا جو آگے چل کر ''علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۸۷۰ء کے آخر میں سرسید احمد خاں ہندوستان لوٹے اور اپنے خیالات کو عملی صورت دینے کی کوشش شروع کی چنانچہ ۲۲ ردسمبر ۱۸۷۰ء کو انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کا پہلا پرچہ شائع کیا۔اس رسالے نے جلد ہی مسلمانوں میں نئی حرکت پیدا کردی اس رسالے میں مذہبی اجتماعی اور علمی مباحث پر مضامین شائع ہوئے۔سرسید، محسن الملک، وقار الملک اور مولوی چراغ علی پوری آزادی کے ساتھ اس رسالے میں اپنے مضامین شائع کرتے رہے۔

۱۸۷۶ء میں سرسید احمد خاں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور علی گڑھ آکر اپنا زیادہ وقت ''مدرسۃ العلوم'' کے کاموں ''گزٹ'' کی دیکھ بھالی اور ''تفسیر القرآن'' لکھنے میں صرف کرنے لگے۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء میں ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کی بنیاد رکھی گئی جو سرسید کا ایک بڑا کارنامہ ہے اس کانفرنس نے مسلمانوں میں روشن ضمیری اور روشن فکری کے آثار پیدا کئے اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کے نمائندوں کی مشترک میٹنگ ہو اور اس میں مسلمانوں کے مسائل پر اظہار رائے ہو اوران کی فلاح و بہود کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں۔سرسید احمد خاں کی ان علمی اور تعلیمی کوششوں کے اعتراف میں ۱۸۸۹ء میں انہیں سی۔یس۔آئی کا اعزاز پیش کیا گیا اوراس ضمن میں ۳رمئی کو علی گڑھ کے انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں جلسہ منعقد ہوا اس موقعہ پر علی گڑھ کے کلکٹر نے سرسید احمد خاں کی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔سرسید احمد خاں کی علمی خدمات کے اعتراف میں ایڈن برا یونی ورسٹی نے ۱۸۸۹ء میں انہیں ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی سند عطا کی۔اس موقعہ پر ایڈن برا کے ایک اخبار Evening Despatch نے اپنے ایک شمارے میں سرسید احمد خاں کی تصویر بھی شائع کی۔

سرسید احمد خاں کے آخری ایام بڑے کربناک گذرے انہیں اس دوران پے در پے کئی

صدمات سے دوچار ہونا پڑا لیکن سرسید کا عزم اور حوصلہ زندگی کے آخری ایام تک جوان رہا۔

لہذا سرسید احمد خاں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ قومی و تعمیری ترقی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اپنے مقصد سے جیسی والہانہ شگفتگی سرسید رکھتے تھے اس نے ان کی پوری زندگی کو ایک اعلی نصب العین کا اعلانیہ بنا دیا تھا۔ آخر کار سرسید اپنی داستان حیات پر ۲۷ /مارچ ۱۸۹۸ء کو ان کی خوابوں کی سرزمین علی گڑھ میں موت کی ناگزیر حقیقت کے ذریعہ مہر اختتام ثبت کردی۔ وہ ہم میں نہیں رہے لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے جو ہمارے لئے صحیفۂ ہدایت ہے ان کی رائے خلوص وصداقت اور راست کرداری میں مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس برعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم وفہم، پاک نفس بزرگ، اور مصلح گزرے ہیں۔ سرسید احمد خاں میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھے۔ ایسا جامع صفات بےلوث و بےنفس، پرعزم واستقلال، سراپا خلوص وصداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا۔ انھوں نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایسا جذبہ قومی پیدا کیا جو اب تک کام کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی انھیں پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصر پاکستان کی بنیاد کی اینٹ اسی پیر نے رکھی تھی۔ ان کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ عمر بھی اسی دھن میں لگے رہے تھے اور آخری دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دنیا سے چل بسے۔ اس طرح قوم کا یہ رہنما مفکر اور مصلح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگیا۔ لیکن اس کے کارنامے رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

2.3 سرسید کے عہد کا مذہبی وسیاسی پس منظر

سرسید کے فکر وعمل کے میدان دو تھے۔ مذہب اور سیاست۔ ان کے علاوہ اگر کچھ تھا بھی تو وہ بھی ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات کے تابع تھا۔ ان کی ادبی حیثیت بھی اس معنی میں ثانوی اور ضمنی

ہو جاتی ہے کہ انہوں نے انشاء اور ادب کو کبھی مقصد اولین قرار نہیں دیا۔ ادب ان کے لئے محض تفریحی مشغلہ نہ تھا، بلکہ ان کے لئے یہ چند مخصوص خیالات وعقائد کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ وہ ادب کو مقاصد زندگی کا متبع اور آلہ کار سمجھتے تھے۔ ہر چند کے ان کا اپنا ادبی سرمایہ خالص ادبی معیار سے بلند اور قابل ذکر ہے۔ اور ان کی انشا اور ان کا طرز بیان، ان کی نثر اور ان کی مقالہ نگاری غرض ان کا کل سرمایۂ تحریر اردو زبان وادب کا قیمتی اور نا قابل فراموش حصہ ہے۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اصولاً ایک سیاسی مفکر اور مذہبی مصنف تھے۔ بلکہ اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو وہ دراصل ایک سیاسی مبصر ہی تھے۔ ان کے مذہبی اور مجلسی نظریے مخصوص سیاسی عوامل کے زیر اثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے تمام تصنیفی کارناموں کو سب سے پہلے ان کے عقائد سیاسی اور افکارِ دینی کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی ادبی حیثیت ان کی سیاسی حیثیت کے تابع ہے۔ ان کا اسلوب بیان اردو نثر کی تاریخ میں جس بلند مقام کا حامل ہے اس کی ایک بڑی بنیاد یہ بھی ہے کہ وہ دور جدید کے اولین بڑے سیاسی مفکر کا اسلوب ہے۔ اگرچہ خالص ادبی لحاظ سے بھی اس اسلوب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ دورِ حاضر کے بہت بڑے مصنف اور اردو کی جدید نثر کے ''معمار اول'' ہیں۔

سرسید جس صدی کے مصنف تھے وہ اصولاً بحث ومناظرہ کی صدی تھی۔ اس میں مشرق ومغرب، قدیم وجدید، بدعت وسنت، شاہی اور جاگیرداری، مذہب اور سائنس، جبلت اور عقل غرض ہر شعبۂ علم وعمل میں ایک طرح کا تصادم نظر آتا ہے۔

سرسید ایک باعمل اور اثر پذیر شخص تھے۔ ان جیسے اثر پذیر شخص کے لئے یہ عملاً ممکن نہ تھا کہ وہ محض بے فکرے تماشائی کا پارٹ ادا کرتے یا گردوپیش سے بے نیاز ہو کر دنیا پر ایک تفریحی نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ وہ خانہ نشین اخبار بین نہ تھے۔ وہ انقلاب کے داعی اور سپاہی تھے۔ اس لئے انہوں نے پرجوش داعیوں اور جنگ آزما سپاہیوں کی طرح فکر وعمل کی اس آمیزش میں عملی حصہ لیا۔

انیسویں صدی کی اس آویزش کے وہ بڑے معرکے جو اس موقعہ پر قابل ذکر ہیں دو ہیں۔ اول

عقل اور مذہب کی معرکہ آرائی، دوم مذہب اور سیاست کا تصادم۔ ان دونوں معرکوں میں ہم سر سید کو ایک پر جوش داعی اور سپاہی کی حیثیت سے سرگرم عمل پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں مذہبی تصادم کی جدید تحریکوں کے اولین علم بردار عیسائی مشنری تھے۔ اہل یورپ کی ملکی فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ ہم عیسائی مبلغوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو بھی بڑھتا اور پھیلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ درحقیقت ان سرگرمیوں کا اصلی محرک اہل یورپ کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں عیسائی سلطنت کے زیر اثر ایک مسیحی کلیسا کی بنیاد رکھی جائے۔ اس زمانے کے عیسائی کشور کشا جنہوں نے ہندوستان کے جنوب اور مشرق میں اپنا تسلط جما لیا تھا دین اور سیاست کو الگ تصور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ مغرب سے آئے ہوئے اولین قسمت آزما مثلاً پرتگیز، فرانسیسی اور کمپنی کے انگریز فرماں روا با تدبیر کشور کشا بھی تھے اور پر جوش عیسائی مبلغ بھی۔ اس وجہ سے ان عیسائی مشنریوں کی تبلیغی کوششیں اتنی بے ضرر نہ تھیں جتنا کہ ان کو بعض اوقات سمجھ لیا جاتا ہے۔ ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان کے تمام مذاہب کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ مگر اسلام پر مشنریوں کے حملوں کی زد بہت زیادہ منظم اور زیادہ سخت تھی۔ اس لئے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں سامی الاصل مذاہب تھے اور دونوں کی بنیادی اصطلاحیں اکثر مشترک اور باہم مانوس ہونے کے علاوہ عقائد اور ارکان میں بھی اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اوروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ ایک سیاسی حربہ بھی تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے اثرات کو دور کرنے اور اس کے دوبارہ وجود میں آنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری سمجھا گیا تھا کہ مسلمانوں کے دینی اور مذہبی احساس کو جہاں تک ممکن ہو مٹا دیا جائے تاکہ دینی تنظیم کی ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یکجہتی بھی ختم ہو جائے۔ عیسائی مبلغوں کے سامنے اس صدی کا غالباً سب سے بڑا منصوبہ یہی تھا کہ عیسائی پرچم کے زیرِ سایہ ہندوستان سے اسلام کے اثر کو بالکل زائل کر دیا جائے۔

عیسائی مشنریوں کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے ہر طرف مذہبی مباحثوں کے دروازے کھل

گئے۔اس کے زیر اثر جہاں خود مسلمانوں کے اندر فرقہ بندی کی جنگ زیادہ مشتعل ہوئی وہاں ہندوؤں میں بھی مذہب کے متعلق نئی جستجو اور چھان بین کی ابتدا ہوئی۔ بنگال میں راجہ رام موہن رائے نے (جو ایک روشن خیال شخص تھے اور فارسی دان تھے) ہندو دھرم کی قدیم روایات سے کسی حد تک منقطع ہو کر ایک نئے سلسلہ خیال کی بنیاد رکھی۔جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ تمام مذاہب اصلاً ایک ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد پنجاب میں سوامی دیانند سرسوتی نے ہندوؤں میں سورمائیت یا ہندو عصبیت کی روح پیدا کرنے کی غرض سے آریہ سماج کی تشکیل کی۔اس تحریک کے ذریعہ ایک طرف ہندوؤں کو یہ بتایا گیا کہ دنیا کی بہترین تعلیم ہندو مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف غیر ہندو مذاہب پر تنقید کے ذریعہ ہندومت کی برتری کا احساس پیدا کیا۔اس تحریک کی زد عیسائیت کے علاوہ اسلام پر بھی پڑتی تھی۔

اگرچہ یہ سب قوتیں ملک میں مذاہب کی تنقید و تقابل کا کام کر رہی تھیں مگر ان مذہبی تحریکوں میں اتنی قوت اور شدت نہ تھی کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کے دل میں دین کی حقانیت کے بارے میں کچھ شبہ پیدا ہوسکتا ہو بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیر مذاہب کے مذہبی نوعیت کے حملوں کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبی عصبیت کو ایک حد تک فائدہ پہنچا اور انہیں اس بات کا موقع ملا کہ وہ اسلام کو ایک بار پھر مذاہب عالم کے مقابلے میں جانچ تول کر دیکھ سکیں۔اسلام کو ہندوؤں کی مذہبی یلغاروں سے کچھ زیادہ خطرہ نہ تھا۔اسی طرح شاید عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے بھی عموماً مسلمانوں پر کچھ اثر نہ پڑتا تھا۔مگر اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک آزمائش وہ تھی جو انیسویں صدی میں یورپ کے علمی افکار کی صورت میں ہندوستان میں نازل ہوئی۔یہ علمی افکار وہ تھے جن سے مذہب یورپ میں اس سے قبل نیم جان ہو کر دم توڑ رہا تھا۔یورپ میں علوم اجتماعی کی ترقی کے ساتھ ساتھ جن کی بنیاد عقلِ محض کے علاوہ سائنس کے تجربوں اور مشاہدوں پر رکھی گئی تھی۔مذہب کی الہامی بنیادوں پر بھی شدید حملے ہوئے اور عیسائیت بلکہ ہر مذہب کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ہندوستان میں ان مغربی افکار کی اشاعت سے اسلام کو حقیقی خطرات سے دوچار ہونا پڑا۔

معاصر علمی نظریات:

ان تصورات کی فہرست زیادہ لمبی نہیں جن سے اس زمانے کے عام ہندوستانی مصنف (بشمول سرسید) بہت متاثر ہوئے۔ ان افکار میں سب سے زیادہ اہمیت ''عقل پسندی'' کو حاصل ہے جو ہندوستان میں یورپ سے پہنچی۔ یورپ اس زمانے میں قدیم روایات کی شکست و ریخت میں مصروف تھا۔ اس زمانے میں عموماً یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ حقیقت تک رسائی اور اس کے ادراک کا سب سے بڑا ذریعہ اور معیار عقل ہے۔ اسی طرح قوانین فطرت کا مشاہدہ اور تجزیہ بھی اس صدی کا ایک بڑا موضوع تھا۔ فطرت یا نیچر جس کا تذکرہ سرسید کی تصانیف میں بکثرت ملتا ہے۔ ایک نہایت وسیع اور کسی قدر نا قابل گرفت اصطلاح ہے۔ مگر بالعموم اس سے وہ ابدی اور ازلی قوانین مراد لئے جاتے تھے جو نظامِ کائنات میں جاری اور نافذ ہیں۔ ان کو صرف تجربہ اور تجزیہ عقلی کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر سچائی یہ ہے کہ اس زمانے کا یورپ خود بھی اس اصطلاح کا صحیح تعین اور تعریف نہیں پیش کر سکا۔ چنانچہ کہیں اس سے مراد وہ ابدی قوانین ہیں جو نظام کائنات کے باطن میں کارفرما ہیں۔ کہیں اس کے معنی فطرت کے خارجی مظاہر اور ان کی رنگارنگی ہے کہیں انسان کے فطری رنگ، طبیعت اور جبلت کو نیچر کہا گیا۔ کہیں اس سادہ اور بے لوث ذہنی اور طبعی حالت کو نیچر کہا گیا ہے۔ غرض فطرت اور نیچر کے مفہوم میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے گویا یہ لفظ اس صدی کا ایک طلسمی لفظ تھا۔ اس سے یورپ کے مفکر اور ادیب اتنے مسحور تھے اور عصری ادب کی روح اس سے اس درجہ سرشار تھی کہ کچھ عرصے کے لئے نیچر اور فطرت کی اصطلاح یورپ کے ذہن وفکر کی سب سے بڑی کلید بن گئی تھی اور جب یورپ کی یہ سوغات ہندوستان پہنچی تو یہاں بھی اس کے طلسم نے غیر معمولی اثر دکھایا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اہل مغرب کی طرح نہ صرف اس کا استعمال کیا بلکہ ایک بڑی مدت تک اس کو سر آنکھوں پر رکھا۔ خصوصاً سرسید، حالی اور شبلی پر اس کے اثرات نمایاں شکل میں نظر آتے ہیں اس صدی کے ہندوستان کو ترقی اور ارتقاء کے مغربی نظریوں نے بھی بڑا متاثر کیا۔ اس خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی ایک متغیر شئی ہے اور تغیر سے مراد یہ ہے کہ زندگی ہر لحظہ ایک نئے روپ میں

اور عموماً حسین روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ان روپوں کی نت نئی تبدیلی کا نام ترقی ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی کہ زمانہ آگے کو بڑھ رہا ہے اور جو قدم آگے پڑ چکا ہے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔پس زندگی اپنی فطری سادگی سے ترقی پذیر ہو کر مرکب اور رنگارنگ پتیوں کی طرح پھیل رہی ہے۔یورپ میں ترقی کے اس نظریہ کو ڈارون کے نظریہ ارتقائے نوعی سے بھی تقویت ملی۔جس نے مشاہدہ اشیاء اور تجربہ کے ذریعہ یہ ثابت کر دکھایا کہ ارتقائے نوعی ایک علمی اور طبعیاتی حقیقت ہے۔

ترقی اور ارتقاء کے ان نظریوں سے سرسید اور ان کے رفقاء بھی بے حد متاثر ہوئے مگر یہ امر قابلِ غور ہے کہ سرسید کو ''ارتقائ'' سے زیادہ ''ترقی'' کی اصطلاح پسند تھی۔اس زمانے کے ہندوستان میں اجتماعیت،سولیزشین،تہذیب اور کلچر کے مغربی تصورات نے بھی خاص اثر دکھایا اور سرسید اور ان کے رفقاء ہندوستان میں جدید نظریہ تہذیب کے سب سے بڑے مبلغ اور داعی تھے۔اس خیال کی تصدیق اس بات سے ہوسکتی ہے کہ انہوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں تہذیب کے موضوع پر بہت سے مقالے لکھے ہیں۔انہیں اس موضوع سے اتنی دلچسپی تھی کہ شدید غلط فہمیوں کے خطرے کے باوجود انہوں نے تہذیب اور اس کے جدید تصور کی بحث کو جاری رکھا اور برابر ان اعتراضات کا جواب دیتے رہے جو پرانی روایات کے علمبرداروں کی طرف سے کئے جاتے تھے۔

یہ اجمالاً اہم مسائل جو سرسید کی تحریروں میں روح کی طرح موجود ہیں۔ان افکار کی قدر و قیمت کی بحث طویل ہے۔مگر مختصر یہ کہ جہاں ان تصورات نے فکر و نظر کی حدود کو وسیع کیا وہاں ان سے زندگی کی جذباتی اور روحانی بنیادوں کو بہت ضعف پہنچا۔ان خیالات سے ان عقائد کو بھی نقصان پہنچا جو دین کے زیرِ اثر انسانی زندگی کی غایت اور اعمال انسانی کی منتہا کے متعلق لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو چکے تھے۔یہاں تک کہ خود مذہب میں اس کا مادی تصور اس کے روحانی نصب العین پر غالب آ گیا۔اور اس خیال نے اتنی طاقت حاصل کر لی اور یہ یقین محکم ہو گیا کہ کسی سچے مذہب کو دنیاوی اور مادی منافع کے اعتبار سے مفید ہونا چاہیے۔گویا مذہب صرف دنیاوی منافع کے لئے ہے اس کا کوئی دوسرا پہلو نہیں۔یہ

اس خیال کی ضد ہے کہ زندگی کا منتہا خدا تک پہنچنا اور روحانیت کی تکمیل ہے اور یہ وہ مقصد ہے کہ اگر اس کے لئے مادی منافع اور دنیاوی خوشحالی کی قربانی بھی کرنی پڑے تو کر لینی چاہئے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں عقلی نقد و جرح نے وحی والہام جیسی غیر مرئی اور وجدانی حقیقتوں کو مشکوک بنا دیا اور مذہب کے مافوق الفطرت اور ماروائی حصے کو مشتبہ بنا کر نبوت اور اس کے روحانی کمالات کو بھی غیر یقینی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب کچھ یورپ میں بھی ہوا اور اس کے زیر اثر ہندوستان میں بھی ہوا۔ مگر یہاں مقابلہ ذرا سخت تھا۔ اس لئے کہ یہاں کی فضا ذرا مختلف تھی۔ اس کے علاوہ یہاں ان تصورات کو پھیلانے والے بہت حد تک خود بھی ان کی حقیقت اور نوعیت سے بے خبر تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ سر سید کے رفقاء میں سے بعض نامور افراد مثلاً وقار الملک، محسن الملک، حالی، شبلی اور نذیر احمد بھی ان نظریات کے متعلق کچھ گومگو میں تھے۔ چنانچہ ان کی تحریروں سے اس کے کافی ثبوت مہیا ہو جاتے ہیں۔

سر سید اس دور کے ایک عظیم مفکر تھے۔ وہ اس معنی میں مذہبی مفکر نہ تھے کہ انہوں نے دینی ادب کی گہرائیوں تک پہنچ کر اس کے معارف و حقائق کو از سرِ نو بیان کیا بلکہ اس معنی میں کہ انہوں نے مذہب پر بہ حیثیت مذہب نئے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی۔ یہ نقطۂ نظر انہیں ماحول سے حاصل ہوا تھا اور اس کے قائم کرنے میں خارجی اثرات نے بڑا کام کیا تھا۔ سر سید کا عقیدہ یہ تھا کہ مذہب کو علوم جدیدہ کی روح اور ان کے اصول سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں سر سید کی اصلاحی تحریک اس اصلاحی تحریک سے بالکل مختلف تھی جس کے علمبردار حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ تھے۔ ان کا نصب العین تزکیہ روحانی اور تصفیہ باطنی تھا۔ سر سید کا نصب العین خالص عقلی اور عملی تھا۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

سر سید کی نظر میں دین اور سیاست دو جدا شعبے نہ تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے سیاسی مسائل کو حل کرتے وقت دین سے امداد لی اور سیاسی مغائرتوں کو دور کرنے کے معاملے میں بھی مذہب کی سند لی۔ اس معاملے میں ان کا نقطۂ نظر سراپا مذہبی معلوم ہوتا ہے۔ سیاست کی بحثوں میں انہوں نے

تمدنی، جغرافیائی، اقتصادی اور عقلی معیاروں کو بہت کم مدنظر رکھا ہے۔ حالاتِ زندگی کے ماتحت ان کا مطمح نظر ملکی اور جغرافیائی کم تھا۔ دینی اور مذہبی زیادہ تھا۔ اور یہ ہندوستان کی پر پیچ سیاسی فضا میں قدرتی بھی تھا۔ ان کے تصورات کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ انہوں نے اصولاً دین کو دنیا کا پاسبان بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر سیاست میں وہ دین کے پاسبان ہیں اور سیاسی مسائل کو مذہبی اور دینی زاویہ نظر سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ سرسید جو دینی امور میں مغربی نظریات سے قدم قدم پر استفادہ کرتے ہیں۔ سیاست کے معاملے میں یوں معلوم ہوتا ہے گویا انہوں نے یورپ کے سیاسی تصورات کا نام تک نہیں سنا، ان کا نظریہ وطنی کم ملیّ زیادہ تھا۔

سرسید کے افکار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے مقابلے میں جدید اور ماضی کے مقابلے میں عہد حاضر سے زیادہ وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنی تفصیلی زندگی کے ایک خاص دور میں تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی تھی اور وہ بعض صلاحیتوں کی بنا پر اچھے مورخ بھی بن سکتے تھے۔ مگر انہوں نے مستقلاً تاریخ نگاری کا مشغلہ اختیار نہیں کیا۔ ان کا ذہن تجدد پسند تھا اسی کے زیر اثر انہوں نے عہد حاضر کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ کی اور علم وادب کے جن موضوعات پر لکھا ان میں اصلی مقصد یہی رکھا کہ جہاں تک ہو قوم وملت کی موجودہ حالت درست ہو۔ آثار الصنادید سے قطع نظر ان کی سب کوششوں کی غایت یہی تھی۔ یہاں تک کہ تفسیر القرآن اور تبین الکلام جیسی علمی کوششیں بھی اسی محور کے گرد گھومتی ہیں۔ مسائل حاضرہ سے سرسید کی دلچسپی کا قوی ترین ثبوت ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں موجود ہے۔ وہ اردو کے اولین نامور مقالہ نگار تھے۔ اور ظاہر ہے کہ مقالہ نگار اس وقت تک نامور اور مقبول نہیں ہوسکتا جب تک اسے اپنے سامنے کی زندگی سے خاص دلچسپی نہ ہو۔

تعلیم میں سرسید کے خیالات تجدید کی ہمہ گیر شہرت کے باوجود کچھ زیادہ جدید نہ تھے۔ سائنس کی ترغیب اور انگریزی زبان کی تعلیم اگرچہ اس زمانے کے اعتبار سے بڑے انقلاب انگیز خیالات تھے مگر حق یہ ہے کہ وہ تعلیم کے معاملے میں اتنے انقلابی نہ تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا

ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور ملک کے بعض دوسرے عناصر خصوصاً علماء انگریزی تعلیم کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے مگر یہ رائے منصفانہ نہیں۔ انصاف یہ ہے کہ اس معاملے میں علماء کو اختلاف سر سید کے مذہبی عقائد سے یا پھر انگریزی تمدن سے تھا۔ ان کو انگریزی تعلیم سے اختلاف نہ تھا۔ لیکن چونکہ سرسید انگریزی تعلیم پھیلانے والے تھے اس لئے یہ معاملہ الجھ کر رہ گیا اور بہت سے مغالطے پیدا ہو گئے۔ اسی طرح سر سید نے عربی تعلیم اور قدیم مدارس کے خلاف تہذیب الاخلاق میں بہت سخت مضامین لکھے۔ اس سے بھی ان کے خلاف فضا پیدا ہوئی۔

تعلیم نسواں کے متعلق سرسید کے خیالات وہی تھے جو اس وقت کے عام مسلمانوں کے تھے۔ البتہ لڑکوں کی تعلیم کے متعلق وہ چاہتے تھے کہ ان کا علمی معیار وہی ہو جو کمبرج اور آکسفورڈ وغیرہ میں ہے۔ اس کے لئے انھوں نے تمام عمر جد و جہد کی سرسید احمد خان کے افکار نے ان کے زمانے کی تقریباً سبھی علمی اور ادبی تحریکوں پر اثر ڈالا۔ سیاسیات، اخلاقِ اجتماعی، تعلیم، تاریخ، سیرت، مذہب غرض تمام شعبہ ہائے تحریر ان سے متاثر ہوئے۔ ان تمام موضوعات میں ان کی منصفانہ قابلیت ثابت شدہ ہے۔ مگر بہ نظر غائر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریری سرگرمیوں کے محور دو ہیں۔ اول دینی مباحث دوم اجتماعی مسائل جن میں سوسائٹی کی تعلیم، اصلاح اور ترقی شامل ہے۔ ان کی علمی اور ادبی حیثیت دوسرے درجے پر آتی ہے۔ اگرچہ رتبہ کے لحاظ سے وہ دوسرے درجے کے ادیب نہیں۔

2.4 سرسید کی مضمون نگاری کی خصوصیات

اردو میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی سرسید ہی تھے۔ ادب کی یہ صنف جس کا انگریزی نام Essay ہے یورپ ہی سے حاصل کی گئی ہے۔ یورپ میں اس کو ادبی نوع بنانے والا ایک اطالوی ادیب مان تاں تھا۔ انگلستان میں اس کو مقبول بنانے والے کئی ادیب تھے جن میں بیکن اور ڈرائڈن اور آگے چل کر ایڈیسن اور سٹیل بھی تھے جن کے دو صحیفے سپکٹیٹر اور ٹیٹلر دنیائے ادب میں شہرت عام اور

بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ سرسید نے موخر الذکر دو ادیبوں سے بڑا اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مقاصد کی تفصیل بیان کرتے وقت انہوں نے ان کا خاص ذکر کیا ہے:

''ہمارے اس پرچے (تہذیب الاخلاق) کی عمر سوا برس کی ہوئی اور ۶۳ مضمون اس میں چھپے۔ اب ہم کو سوچنا چاہیئے کہ اس سے قومی تہذیب اور قومی ترقی حاصل ہونے کی کیا توقع ہے جب ہم کچھ اور ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ لنڈن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے اور وہاں بھی اس قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔خدا نے یہ کام لنڈن کے پیغمبروں اور سولزیشن کے دیوتاؤں سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن کی قسمت میں لکھا تھا۔''

(تہذیب الاخلاق، ج:۲،ص ۷۴۴)

پھر ایک موقع پر لکھا:

''ہم نے نامی گرامی یورپ کے عالموں ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے جہاں کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ اے ڈی اور ایس ڈی کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے؟ اور ہماری زبان میں ان خیالات کو ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید نے انگریزی زبان کے ان نامور مضمون نگاروں کے طرز کی تقلید کی کوشش کی چنانچہ کچھ مضامین ایسے بھی لکھے جن کو انگریزی کا ترجمہ یا چربہ سمجھنا چاہیئے۔ سید صاحب اس تقلید میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں اتنا بہرحال مسلم ہے کہ تہذیب الاخلاق کے اجراء کی تحریک انہی مذکورہ بالا پرچوں کے ذریعے ہوئی۔ سرسید کے مضامین تین طرح کے ہیں:

۱۔خالص مذہبی اور دینی مضامین

۲۔سیاسی مضامین

۳۔اصلاح اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین

یہ یاد رہے کہ سرسید کے سارے مضامین باقاعدہ Essay کی حد میں داخل نہیں ہو سکتے۔مگر مضامین کی کافی تعداد ایسی ہے جن کو اس صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔مثلاً تہذیب الاخلاق کے مندرجہ ذیل مضامین؛

تعصب، تعلیم و تربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث و تکرار، سولزیشن، اپنی مدد آپ، گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، رسم و رواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق، انسان کے خیالات، آزادی رائے، تربیت اطفال، سرابِ حیات، خودغرضی اور قومی ہمدردی، آخری پرچہ تہذیب الاخلاق۔

ان سب مضامین میں ان کا اختصار قدر مشترک ہے جو ایک باقاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔سرسید کے بعض مضامین میں Essay کی سی جزویت اور ناتمامیت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک اچھا مضمون اصولاً کسی مرکزی موڈ کا متقاضی ہوتا ہے جس کے اردگرد خیالات کا تار و پود خود بخود تیار ہوتا ہے۔اچھا مضمون کڑی منصوبہ بندی یا پہلے سے مرتب کئے ہوئے خیالات کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی تہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں۔سرسید کے بعض مضامین میں یہ خوبی پائی جاتی ہے مثلاً امید کی خوشی، بحث و تکرار اور گزرا ہوا زمانہ۔ان مضامین میں یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ ان میں معلومات یقینی کی بجائے تخیلات کا غلبہ ہے یوں تو سرسید کے مضامین کی معلوماتی سطح عموماً کرخت ہوتی ہے مگر اچھے مضامین میں وہ تصویریں اور خوش نما نقوش تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔مثلاً مضمون 'سراب حیات میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے' سے ابتدا کی گئی ہے۔اس کے بعد عمدہ مکالمہ آتا ہے۔ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔تصویریں بنتی جاتی ہیں نقوش ابھرتے جاتے ہیں۔ پڑھنے

والے کا دل مضمون کی تہوں میں الجھتا جاتا ہے۔ اور بات دل میں بیٹھی جاتی ہے اور مجموعی تاثر پر مسرت ہوتا ہے۔ یہ ایک عمدہ مضمون کی بنیادی خوبی ہے اور یہ خوبی سر سید کے بعض مضامین میں مل جاتی ہے۔

سر سید کے مضامین میں بعض کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اول تو ان کے عام مضامین طویل ہوتے ہیں۔ پھر ان میں عملی واصلاحی معلومات کی بھرمار ہوتی ہے۔

سر سید کے مضامین کی اس کمزوری کا سبب یہ ہے کہ وہ محض مصلح ہیں انہوں نے اصلاح اخلاق کے لئے ادبی ذرائع پر زیادہ اعتماد نہیں کیا۔ اصولاً ادب اور اخلاق میں کوئی تضاد نہیں مگر اخلاق کی کھلی تلقین ایک غیر ادبی طریقۂ خطاب ہے۔ انگریزی زبان کے بلند پایہ مضمون نگار پہلے ادیب تھے پھر مصلح مگر سر سید پہلے مصلح تھے، پھر کچھ اور تھے۔ اس کی ذمہ داران کی مقصدیت اور ان کے زمانے کا ماحول تھا۔

سر سید کے مضامین میں جو فلسفہ اخلاق پیش ہوا ہے اس کی غایت عملیت اور مقصدیت ہے۔ تہذیب نفس اور مجلسی شائستگی ان کے ضابطہ و اخلاق میں ایک اہم قدر ہے۔ سر سید کے اخلاقی خیالات پر امام غزالی کی تعلیمات کا بھی عکس پڑا ہے مگر امام غزالی کی روحانیت سے انہیں کوئی خاص دلچسپی معلوم نہیں ہوتی۔ اس منطق پسندی نے ان کے مضامین کو خشک بنا دیا ہے۔

کہنے کو سر سید کی مضمون نگاری ایڈیسن وغیرہ سے متاثر ہوتی ہے مگر ان کے مضامین میں وہ روح بہت کم ہے جو ایڈیسن کے اس مقولے میں ہے کہ میرا مقصد ہے--------

"To enliven morality with wit and to tamper wit with morality."

یعنی سر سید کے الفاظ میں

''میں اخلاق میں طبعی کی جان ڈال دونگا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملا دوں گا۔''

سرسید کے مضامین میں ظرافت کے کچھ انداز ضرور پائے جاتے ہیں مگر وہ خوش طبعی جس سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو شاذ و نادر ہی محسوس ہوتی ہے۔

سرسید کے مضامین میں تصورات اور معقولات کا غلبہ ہے۔ زندگی کی خوش نما اور دلچسپ تصویریں کم ہیں۔ وہ زندگی کے خیال انگیز اور دلچسپ مناظر کم پیش کرتے ہیں۔ اعمالِ انسانی اور ان کے مادی فوائد و نقصانات کی فہرستوں یا ان کی معقول توجیہات پر بہت زور دیتے ہیں۔۔ وہ ہر چند نیچر کے دل دادہ ہیں۔ اور استدلال میں اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں مگر نیچر کے وسیع مرغزاروں کی سیر نہیں کراتے۔ ان سب باتوں کے باوجود سرسید اردو کے اولین مضمون نگار ہیں۔ اولین اس معنی میں کہ انہوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا Essay کی صنف کو اختیار کیا اور براہ راست انگریزی زبان کے مضمون نگاروں سے اثر قبول کیا اور آنے والے مضمون نگاروں کے لئے شاہراہیں متعین کیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنے پرچہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندوستان کے تعلق میں خصوصاً اردو کی سادہ نثر کی ترویج کے معاملے میں تقریباً ویسی ہی خدمات انجام دیں جیسی انگلستان میں ایڈیسن اور سٹیل نے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے ذریعے انجام دی تھیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرسید کی مضمون نگاری مذکورہ بالا ادیبوں کی مضمون نگاری سے کوئی خاص مماثلت نہیں رکھتی۔ سرسید کو انگریزی مضمون نگاروں میں سے اگر کسی سے کچھ مماثلت ہے تو وہ بیکن ہے جو انگریزی زبان میں مضمون نگاری کی صنف کا بانی ہے۔

سرسید کے مضامین میں کسی قسم کی لفاظی اور عبارت آرائی نہیں۔ انہوں نے خاص طور پر اس طرز تحریر کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فارسی نثاروں کی تقلید میں اختیار کیا گیا تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ کو تحریر میں دخل نہیں دیتے تھے اور بعض جگہ تو قواعد زبان اور اصولِ انشا پردازی سے بھی بے پروا ہو جاتے تھے۔ ان کے طرز تحریر میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ایک خاص قسم کا زور ہے۔ یہ زور بیان دراصل اس مقصد کا مضمون احسان ہے جس کا پرچار سرسید زندگی بھر کرتے رہے۔ وہ آزادی رائے اور حریت فکر

کے زبردست علم بردار تھے۔قومیت کا جذبہ ان کی رگ رگ میں جاری وساری تھا۔وہ ہر قسم کے مطالب کو اپنی زبان میں نہایت آسانی سے ادا کرتے ہیں۔کیسا ہی مشکل اور دقیق مضمون ہو وہ نہایت صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر جاتے ہیں۔چونکہ چند مخصوص اصولوں کی تبلیغ اور ایک خاص نظریہ زندگی کی تلقین کر رہے تھے۔اس لئے عبارت میں منطقی استدلال پایا جاتا ہے۔

2.5 مضمون 'امید کی خوشی' کا خلاصہ

سرسید احمد خاں مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما اور مصلح قوم تھے،غدر کے بعد مسلمان ہر طرح سے برباد ہو گئے تھے۔ان کی املاک انگریزوں نے ضبط کر لی تھی۔ملازمتیں چھین لی تھیں اور انہیں دہلی سے شہر بدر کر دیا گیا تھا۔مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ایسے میں انہیں دوبارہ آباد کرنے کا،ان کی دنیا بنانے،معاشی خوش حالی اور عزت کی زندگی دوبارہ دلوانے کے لئے سرسید نے ایک تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔قوم نے اس کی زبردست مخالفت کی،دوست احباب بھی بے دلی سے ساتھ دے رہے تھے۔مخالفتوں کا طوفان تیز ہونے لگا تو سرسید پریشان ہو گئے۔خیال کیا کہ تعلیمی تحریک سے دستبردار ہوئے تو قوم کبھی سر اٹھا نہ سکے گی،اس لئے اپنے دل کو حوصلہ اور تقویت دینے کیلئے امید کا سہارا تلاش کیا۔انہوں نے بڑی بڑی تاریخی ہستیوں کا تصور کیا کہ مشکل کا سامنا کرنے کے لئے انہوں نے تدبیریں اختیار کیں۔انہوں نے پایا کہ سب نے امید ہی کا دامن تھاما تھا۔

اس مضمون میں سرسید کا طرز بیان بہت سادہ ہے مگر خلوص اور جذبہ کی شدت نے اس کے اندر بہت تاثیر پیدا کر دی ہے۔اس مضمون کے لکھتے وقت سرسید نے انسانی نفسیات کے بعض اصول پیش نظر رکھے ہیں۔کامیابی اتفاقی نہیں ہوتی،اس لئے کہ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جو لوگ مشکلات سے ڈر جاتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے اس کے برعکس مشکلات سے پست ہمت ہوئے بغیر جو لوگ امید کو جد و جہد کے راستہ میں اپنا رہنما بناتے ہین وہ اپنی منزل مراد کو پالینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مستقبل میں حاصل ہونے والی کامیابی سے ہمارا دل ابھی سے خوش ہونے لگتا ہے۔دور کی چیزیں بہت سہانی لگتی ہیں،اس بات کو سرسید مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔

مستقبل آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے، اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کیا کہا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے ساتھ امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں سرسید نے کئی مثالوں سے یہ نکتہ واضح کیا ہے۔ ماں محض اس امید پر بچے کی پرورش کی ساری مشکلات سہہ لیتی ہے کہ بڑا ہو کر وہ اس کے بڑھاپے کی لاٹھی بنے گا۔

سرسید ہر مشکل پر سہارا دینے والی اس امید کو اچھے اچھے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کبھی اسے نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی کہتے ہیں۔ کبھی آسمانوں کی روشنی، کبھی ناامید دلوں کی تسلی، کبھی بے قرار دلوں کی راحت اور شکستہ دلوں کی تقویت اور کبھی اسے ایمان کی خوبصورت بیٹی کہتے ہیں۔ طرح طرح سے یاد کرنے کا اصل سبب یہ ہے کہ مشکلات کی سخت گھڑیوں میں یہی ''امید'' ہمارے لئے راستہ نکالتی ہے بلکہ یہی مشعل راہ ثابت ہوتی ہے۔

طرح طرح کے خوبصورت ناموں سے اسے یاد کرنے کے بعد، اس کے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں انہوں نے وہ سارے تصورات اور مثالیں مضمون کی شکل میں محفوظ کر لیں جو وقت ضرورت امید کا دامن تھامنے کے لئے مددگار ثابت ہوسکتی ہیں، اسی کو انہوں نے امید کی خوشی کا نام دیا۔

سب سے پہلے انہوں نے روشن مستقبل کے خوش آئند تصور کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسے پانے کی امید میں ہی لوگ سخت سے سخت مشکلات برداشت کر لیتے ہیں۔ پھر ایک ماں کی مثال بیان کرتے ہیں کہ وہ بچہ کی پرورش کی ساری تکالیف اسی لئے برداشت کر لیتی ہے کہ اسے امید ہوتی ہے کہ وہ جوان ہو کر اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

پھر سرسید کو انبیاء کا خیال آتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام اپنی خطا پر بے حد نادم تھے، اسی امید نے انہیں معافی کی دعا کی ترغیب دی تھی، نتیجہ میں اللہ تعالی نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا تھا بلکہ فرشتوں سے سجدہ کرا کے ان کا مرتبہ بھی بلند فرمایا تھا۔

پھر وہ حضرت نوح علیہ السلام کا تصور کرتے ہیں جو طوفان میں گھرے ہوئے ہیں دور دور تک کنارہ نظر نہیں آتا، مگر وہ ناامید نہیں ہوتے، ایک تدبیر کرتے ہیں اور جب وفادار کبوتر زیتون کی ٹہنی

چونچ میں دبالاتا ہے تو یہ خیال انہیں خوش کردیتا ہے کہ کنارہ پاس ہی ہے۔

پھر وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ یاد کرتے ہیں جو لاڈلے بیٹے کے کھو جانے پر رو رو کر اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں مگر دل میں امید رہتی ہے کہ کسی روز گم شدہ بیٹے سے ملاقات ضرور ہوگی، یہ امید نہ صرف انہیں مایوس ہونے سے بچاتی ہے بلکہ آخرکار بیٹے کی ملاقات سے مسرت بھی پہنچاتی ہے۔

خود حضرت یوسف علیہ السلام کی پریشانی جیل میں کم نہ تھی مگر انہیں امید تھی کہ ان کی بے گناہی ایک نہ ایک دن ثابت ہو کر رہے گی، تبھی تو ان کی شرافت اور نیک نفسی کا تمام مصر میں چرچا ہو سکا تھا۔

ان تمام واقعات کو یاد کرتے ہیں تو امید کی اس زبردست کارفرمائی کے سامنے اپنی ساری پریشانیاں گھلتی اور غائب ہوتی ہوئی پاتے ہیں۔ ان کے اندر نیا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، وہ نئے ولولے کے ساتھ اپنی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے اور وہ علی گڑھ میں اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ہی برسوں میں ایک یونی ورسٹی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

سرسید اپنے اس مضمون 'امید کی خوشی' میں امید کے دائرہ کار اور اس کی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں۔ انبیاء کے قصوں سے مثالیں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان بزرگ ہستیوں کو صرف امید نے مایوس ہونے سے بچایا تھا، نتیجہ اخذ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہمیں بھی چاہئے کہ مایوسی سے بچنے کے لئے امید کا دامن تھامے ہوئے جدوجہد کریں۔ ایسا کرنے پر امید ہمیں ضرور منزل مراد کو پہنچائے گی۔ خود اپنے کام کے سلسلہ میں سرسید اس مثبت جذبہ سے حوصلہ پاتے ہیں۔

امید کا دائرہ عمل صرف دنیا کے کاموں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ سرسید کہتے ہیں کہ جنت کی امید ہی موت کو بھی آسان کرتی ہے۔ ان ساری مثالوں سے سرسید واضح کرتے ہیں کہ امید کا دامن ہمیشہ تھامے رہنے میں بڑی دانش مندی پوشیدہ ہے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

سرسید کا یہ مضمون جہاں خود ان کے لئے حوصلہ اور ہمت کا ذریعہ بنا تھا، اس سے عام لوگ بھی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے حوصلہ اور ہمت پاتے ہیں۔ سرسید کا یہ مضمون اپنے اندر زبردست تاثیر رکھتا ہے، پڑھنے والا اس سے بہت اثر قبول کرتا ہے۔

2.6 مضمون ''تعلیم وتربیت'' کا خلاصہ

سرسید کو ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا مسیحا کہا جائے تو بجا ہے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے سارے مصائب کا علاج اور ان کے سارے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ انھیں جدید تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ انھوں نے اس کے لئے عملی قدم بھی اٹھایا اور اس سلسلے میں انھیں سب سے پہلے جس مسئلے سے دوچار ہونا پڑا وہ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ تھا۔

سرسید کی رائے یہ تھی کہ ابتداء سے لےکر اعلی مدارج تک ساری تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہئے۔ سرسید مسلمانوں میں جدید تعلیم عام کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے یورپ کی درس گاہوں کو بطور نمونہ پیش نظر رکھنے کے خواہش مند تھے۔ انگلستان کا سفر انھوں نے اسی مقصد کے لئے اختیار کیا تھا۔ وہاں اعلی تعلیم کی درس گاہوں کو انھوں نے خود دیکھا اور وہاں کے نظام تعلیم کو پسند کیا۔ ان درس گاہوں کی جو چیز انھیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ نیچے سے اوپر تک ذریعۂ تعلیم مادری زبان تھی۔ تعلیم کے اس طریقے کو وہ اپنے ملک میں رواج دینا چاہتے تھے۔

سرسید جب تعلیم وتربیت پر زور دے رہے تھے تو ان کو اس بات کا خیال تھا کہ محض معلومات اور تعلیم وتربیت کے مدراج میں فرق ہے۔ تعلیم سے ان کا مطمح نظر صرف معلومات کا فراہم ہونا نہیں تھا بلکہ علم کا اس طرح حاصل ہونا تھا جس سے انسان کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوں اپنے مضمون ''تعلیم و تربیت'' میں لکھتے ہیں؛

> ''انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے
> بلکہ اس کے دل کے سوتوں کو کھولنا اور اس کے اندر کے سرچشمے کے پانی کو
> باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قوی کو حرکت میں لانے اور شگفتہ وشاداب

کرنے سے نکلتا ہے۔"

ان کے نزدیک ایسی تعلیم بالکل بے سود تھی جس سے عقل انسانی کو شگفتگی وشادابی اور اس کے روحانی واندرونی قوی کو توانائی حاصل نہ ہو۔ جب عقل انسانی کو شگفتگی حاصل ہوگی تو وہ انسانی مسائل پر غور کرے گی، ان کا حل تلاش کرے گی، انسان کی مشکلات کو دور کرے گی، اس کے لئے آسانیاں اور آسائشیں فراہم کرے گی، اس کی مادی ضرورتوں کی تکمیل کریگی، قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں تک رسائی حاصل کرے گی، قدرت میں بکھری ہوئی نعمتوں کو یکجا کرے گی اور اس کی بچھری ہوئی قوتوں کو اپنے قابو میں لائے گی اور اندرونی قویٰ توانائی سے انسان کو حوصلہ حاصل ہوگا۔ اس کے دل میں نت نئی امنگیں پیدا ہوں گی اور ان امنگوں کو روبہ عمل لانے کے لئے وہ جدو جہد کرے گا، راہ کی رکاوٹوں کو دور کرے گا، خارجی طاقتوں کی غضبنا کی سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ان کا مقابلہ کرے گا اور پھر اپنے عزم وحوصلہ سے ان کو مغلوب کر کے کامرانی کے پھریرے لہرائیگا۔

ارتقائی انسانی کی تاریخ کو دیکھئے تو انھیں دو باتوں کی کافرمائی نظر آتی ہے۔ یعنی عقل کی شگفتگی اور اندرونی قوی کی توانائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی نعمتوں کے بے شمار خزانے بھی پیدا کردیئے۔ خام مواد کی صورت میں اور عقل کی صورت میں ان خزانوں کی کنجی بھی اس کے سپرد کر دی کہ وہ ان خزانوں کو کھولے ان کے مواد پر قبضہ جمائے اور ان کو اپنے کام میں لانے کی تدبیر وترکیب کرے۔ اگر کسی تعلیم سے دل کی سوتیں نہ کھلیں اور قوائے عقلی کو حرکت نہ ہو تو وہ تعلیم بے کار ہے۔ سرسید جس دور میں سانس لے رہے تھے اسی میں مشرقی تعلیم کا کچھ یہی حال ہو گیا تھا کہ اس سے زندگی میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے زندگی کے نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی سرسید تعلیم کو زندگی کی نشوونما کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے یعنی تعلیم کو زندگی کی نشوونما میں معاون ہونا چاہئے۔ انھوں نے تعلیم کو مشرق اور مغرب کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جمود وحرکت زوال و ارتقاء اور پس روی وپیش روی کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس تعلیم کے داعی ونقیب بنے جو جمود کے بجائے

حرکت زوال کے بجائے ارتقاء اور پس روی کے بجائے پیش روی میں مددگار ہو۔ اس سے ذہن کے دریچے کھلیں، صلاحیتوں کے سربند چشمے اس سے جاری ہوسکیں۔

سرسید نے تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جہاں موقع ہوا وہاں مدرسہ قائم کیا اور آخر میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔ ان کا یہی مقصد تھا کہ قوم کے لئے ایک ایسی تعلیم گاہ قائم ہو جہاں قوم کے بچے تعلیم حاصل کریں، ان میں قومی شعور پیدا ہو اور احساس قومیت بیدار ہو اور نہ صرف تعلیم تک رسائی ہو بلکہ تعلیم کے وہ فیوض و برکات بھی ظاہر ہوسکیں۔

سرسید کا تعلیمی آدرش تو یہ تھا کہ آدمی کو انسان بنادیا جائے۔ جس طرح ہتھوڑی اور چھینی کے استعمال کے بغیر پتھر میں چھپی ہوئی مورت برآمد نہیں ہوتی اسی طرح سخت محنت اور تدبیر مسلسل کے بغیر انسان بھی برآمد نہیں ہوتا۔ سرسید تعلیم کے ساتھ تربیت کو لازم قرار دیتے رہے کہ رجحانات کی صحیح سمت مقرر کرنے والی چیز دراصل تربیت ہے ہم اولاد کو لاڈ پیار سے پالنے اور ان کے لئے عیش و آرام مہیا کرنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہم نے ان کی تربیت کا حق ادا کیا حالانکہ بقول سرسید:

> ''حقیقت میں وہ تربیت عمدہ تربیت نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کو کچھ لیاقت نہیں آتی اور ان کے دل میں اخلاقی فیاضی اور طبیعت کی آزادگی اور دل کی کشادگی نہیں ہوتی۔ تمام قویٰ جو ان میں خدائے تعالیٰ نے رکھے ہیں سب پژمردہ اور ناکارہ رہ جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں وہ قویٰ جن سے انسان اپنے کسی زمانۂ عمر میں نام آور دل چلا اور عالی حوصلہ غیرت والا ہوتا ہے باقی نہیں رہتے۔''

خود ایک جگہ غیرت مندی کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے وضاحت کی ہے کہ غیرت سے مراد مہذب دلیری، مودب بہادری اور ممدوح خودداری ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جن کے حامل انسان کو

اقبالؔ نے کبھی شاہین، کبھی مردمومن اور کبھی انسان کامل سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے شاعرانہ حیثیت سے ایک آدرش انسان کا خواب دیکھا ہے لیکن سرسید سے کہیں پہلے ایک عملی انسان کے حیثیت سے اس کے لئے تجاویز بھی پیش کر چکے تھے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''پڑھنا لکھنا آجانے سے اور منطقی یا فلسفی ہوجانے سے کامل تربیت خیال نہ کر لینی چاہئے قطع نظر اس کے کہ علوم غیر مفیدہ کچھ بھی مفید نہیں ہوسکتے صرف پڑھ لکھ لینے سے تربیت کامل نہیں ہوجاتی بہت سے پڑھے لکھے ایسے موجود ہیں جو بہ لحاظ تربیت کے محض ایک کندۂ ناتراش ہونے سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔ پس تربیت کامل کے لئے جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے، ویسا ہی اس کے ساتھ لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضروری ہے جس سے روز بروز اس کے خیالات کو وسعت ہوتی جائے۔ اس کی امنگ بڑھتی جائے، اس کے قویٰ شگفتہ و شاداب رہیں، غیرت جو ایک بڑا جوہر انسان کا ہے اور برائیوں سے بچانے کے لئے نہایت عمدہ سچا محافظ ہے۔ ہمیشہ ترقی پر رہے۔''

اسی لئے سرسید نے جب مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس میں صرف کتابی تعلیم ہی کو مد نظر نہیں رکھا بلکہ نونہالان قوم کی تربیت کے لئے اقامتی زندگی پر بھی زور دیا۔ اس میں ایسا نظم وضبط قائم کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعہ مطلوبہ تربیت کا اہتمام ہو سکے اور انسانی خوبیوں میں جو کھوٹ اس کی عدم تربیت کی وجہ سے پیدا ہوجاتا ہے وہ دور ہو سکے۔ نظم وضبط اور تعلیم وتربیت جتنی انسانی فلاح کے لئے ضروری ہے، اتنا ہی انسان طبعاً ان سے گریزاں رہتا ہے۔

سرسید کے خیالات آج بھی ایک مینارِ نور کی طرح ہمارے لئے رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔

2.7 مضمون ''رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات'' کا خلاصہ

اس مضمون میں سرسید نے سماج کے غیرضروری رسم ورواج کی پابندیوں کے نقصانات سے ہمیں آگاہ کرایا ہے اور ہمیں یہ بتلایا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے انہیں اپنانے میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ صرف نقصان ہی ہے۔

سرسید لکھتے ہیں کہ

> ''ایک بہت بڑے عقل مند آدمی کا قول ہے کہ' آدمی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے اعضاء متناسب ہوں۔ اس کے قویٰ مضبوط ہوں اور اس کے جذبات وخیالات روشن اور شگفتہ ہوں۔ ان میں کسی طرح کی کمی یا نامناسبت نہ ہو ہوتا کہ وہ ایک خوبصورت اور مکمل روپ پا سکے۔ اس قول کے برعکس جہاں پرانی رسم ورواج کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے اور ان رسموں پر نہ چلنے والا ایک حقیر بلکہ مردود سمجھا جائے وہاں نہ آدمی کی خواہش باقی رہتی ہے اور نہ وہ مناسبت جس کا وہ متمنی ہوتا ہے۔' اسی طرح ایک دانش مند کا قول ہے کہ' آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔'''

مگر جہاں رسم ورواج کی پابندی سماج میں اتنی اہم سمجھی جائے کہ اس پر نہ چلنے والے کو برا سمجھا جائے وہاں آدمی کو اس کے پیدائشی حق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

سرسید لکھتے ہیں کہ دنیا میں کسی بھی آدمی کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو صرف ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہوئے زندگی گزارنا چاہئے اور سوائے پیروی کے کچھ اور نہ کرنا چاہئے کیا کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمی کو اپنی گزراوقات کے طریقے اور کاروبار کی کاروائی میں اپنی خواہش اور اپنی رائے کے مطابق کوئی کام نہ کرنا چاہئے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے ہر ایک کی یہی رائے ہوگی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی

جوانی میں دوسروں اور اپنے بزرگوں کے جو تجربے مجرب اور عمدہ ثابت ہو چکے ہیں صرف ان سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ بزرگی کو پہنچ جائے تو خود اپنی زندگی کے تجربات کو عقل کی پختگی سے پرکھے اور ان کی اچھائی برائی کو جانچے اور اچھے نتائج نکالے۔

رسومات کی پابندی میں آدمی بغیر سوچے سمجھے لگا رہے تو اس کی زندگی میں بہت سی صفتوں کی ترقی رک جائے گی۔ اسے ان قوتوں کو برتنے کا موقع نہیں رہتا جو کسی چیز کی بھلائی و برائی کے دریافت کرنے، کسی بات پر رائے دینے، دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل وفہم کر تیز رکھنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اسی کے برعکس جو آدمی اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے۔ وہ آدمی اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے، زمانہ حال پر نظر رکھنے کے لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوت تجویز اور اسی کا تصفیہ کرنے کو قوت استقرا اور بھلا برا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اسی پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال کی ضرورت پڑتی ہے یہ سب کام انسان کے لئے ضروری ہوتے ہیں مگر رسم و رواج کی پابندی میں انسان ان قوتوں کو استعمال کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ انسان کوئی مشین یا مشینی پرزہ نہیں کہ جو کسی کام پر لگا دیا جائے تو بس صرف وہی کام کرتا ہے بلکہ انسان تو اس درخت کی طرح ہے جو اپنی اندرونی قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے وہ چہار طرف پھیلے بڑھے اور ترقی کرے۔ اسی لئے تو انسان زندہ مخلوق کہلاتا ہے۔

یہ ساری بحث اور اوپر لکھی ہوئی ساری باتوں کا اختصار یہ ہے کہ آدمی اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لے اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طریقے پر کرے۔ یعنی جو باتیں عمدہ اور مفید ہیں۔ ان کو اختیار کرے اپنائے جو قابل اصلاح ہیں ان میں ترمیم کرے اور جو بری اور خراب ہیں ان کی پابندی چھوڑ دے۔

ہمارے ذہنوں میں یہ بات بھی سمائی ہوئی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جب کہ کسی چیز کی اچھائی کو اپنانا اور برائی سے پرہیز اسی

وقت پر ممکن ہے جب انسان اپنی قوت امتیاز اور عقل وفہم کو کام میں لائے مگر اس کے برعکس ہمارے سماج میں ہر شخص اعلیٰ سے ادنیٰ تک رسم ورواج کا ایسا پابند ہے۔ جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔

کوئی شخص اپنے آپ سے یہ سوال نہیں پوچھتا کہ کوئی رسم اس کے لئے کہاں تک اچھی ہے اور اس میں پسند اور ناپسند کے لائق کیا باتیں ہیں بلکہ اکثر لوگ تو صرف اسی بات پر توجہ دیتے ہیں کہ اس سے رتبہ اور مرتبے میں بڑے آدمی ہیں وہ کن کن رسموں کو اپناتے ہیں تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کے ان کی سی شان میں شامل ہو جائے۔ کوئی آدمی اس طرح نہیں سوچتا کہ پرانی رسمیں غالباً اِس زمانے کے سماج میں جگہ پائیں۔ مفید اور اچھی تصور کی گئی ہوں مگر اب صورتحال دوسری ہو۔ ان رسومات کوئی فائدہ نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ان کی رائے میں کوئی غلطی ہو۔ یا ان کا تجربہ صحیح نہ ہو یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو۔ دوسروں سے اس کا کوئی سروکار نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ رسم اسی زمانے میں مفید رہی ہو اور اس زمانے میں مفید نہ رہی ہو۔ غرض رسومات کی اندھی تقلید ہر حال میں مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر شخص کو نہیں ہوتی بلکہ صرف چند اشخاص کو ہوتی ہے جس کی پیروی سب لوگ کرتے ہیں۔ لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں بھلائی برائی مفید وغیر مفید ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی ہوتی ہے۔ مگر دوسری قسم کی پیروی اپنی پسند پر ہوتی ہے۔ ہم اس کو اس لئے اپناتے ہیں کہ اس میں ہمیں فائدہ نظر آتا ہے۔ ایسا سوچ کر کسی چیز کو اپنانے میں انسانی ترقی کی جو قوتیں ہوتی ہیں وہ کام کرتی رہتی ہیں اور ہماری زندگی ترقی پر رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانے میں ہر قسم کی ترقی اور ہر اعتبار سے اچھی ہیں بہت سی رسمیں پائی جاتی ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی کی جاتی ہے تو وہ قوتیں کیوں کر ترقی پر ہیں۔ ایسا

سوال کرنے والوں کا سوال بھی صحیح ہے اور ایسا اعتراض کرنے والوں کا اعتراض بھی صحیح ہے۔ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ کسی بھی قوم میں رسموں کی پابندی کا نقصان ہونا ضروری ہے مگر یہ بات نہایت غور طلب ہے کہ یورپ میں رسموں کی اصلاح اور اس میں ترمیم وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً یہ پوشاک جواب انگریزوں کی ہے۔ ان کے باپ دادا کی نہیں تھی۔ یہ رسم پوشاک دھیرے دھیرے بدلتی چلی گئی۔ کسی زمانے میں یورپ میں ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگوں کا لباس مختلف تھا۔ اس رسم کو بھی چھوڑ دیا گیا اور ضروری سمجھا گیا کہ ہر شخص کا لباس ایک جیسا ہو اگر کوئی شخص اس پرانی رسم کے برخلاف اس سے عمدہ چیز ایجاد کرے تو لوگ اسی پر اتفاق کرتے ہیں۔ اسی کو قبول کرتے ہیں اور اپنا لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ یورپ والے بھی ہماری ہی طرح رسموں کی پیروی میں مبتلا ہیں، محض نادانی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ رسومات کی پیروی میں وہ اور ہم ایک جیسے ہیں۔

یورپ کی قومیں ہوں یا چین کے لوگ جو اپنی عقلمندی اور دانش وری میں جواب نہیں رکھتے جب تک ان میں تغیر و تبدل کا سلسلہ جاری رہے ان میں ترقی باقی رہے گی اور جب ان میں بھی وہ قوتیں جونئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں زائل ہو جائیں گی تو ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کی ترقی بھی ٹھہر جائے گی اور تنزل شروع ہو جائے گا۔

پس مسلمانوں کو اپنی رسومات کی پابندی پر بے حد غور کرنا چاہئے اور جہاں جہاں اس میں ترمیم کی ضرورت پڑے ضرور کرنا چاہئے۔ تاکہ ہماری ترقی باقی رہے البتہ ہم یہ ضرور دیکھیں کہ ان ترمیم رسومات سے ہماری مذہبی اور احکام شرعی میں کوئی کمی یا کمزوری نہ آنے پائے۔

2.8 مضمون ''اخلاق'' کا خلاصہ

اس مضمون میں سر سید نے مسٹر ایڈیسن کے مضمون ''اخلاق'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

مسٹر ایڈیسن نے مذہب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) اعتقاد

(۲) عملیات

مسٹر ایڈیسن کا خیال ہے کہ اعتقادیات میں وہ مسائل آتے ہیں جو وحی سے معلوم ہوتے ہیں اور عقل و نیچر سے اس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ عملیات میں صرف ان مسائل کا ذکر ہوتا ہے جو عقل و نیچر کے مطابق بھی ہوتے ہیں اور مذہب بھی اسی کی ہدایت کرتا ہے۔ اس طرح وہ پہلے حصے کو عقائد اور دوسرے حصے کو اخلاق کے نام دیتے ہیں۔ مگر سر سید کا خیال اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ اعتقادیات کو بھی عقل و نیچر اور کارخانہ قدرت کے اصولوں پر سمجھنا ناممکن نہیں۔

مسٹر ایڈیسن کا خیال ہے کہ کچھ لوگ اعتقادیات پر اس قدر خیال کرتے ہیں کہ وہ اخلاق کو بالکل بھول جاتے ہیں اور کچھ اخلاق پر اتنے متوجہ ہوتے ہیں کہ اعتقادیات کا خیال ہی نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ صاحب کمال تو وہ ہے جو ان دونوں میں سے کسی بات میں ناقص نہ رہے۔ مگر سر سید مسٹر ایڈیسن کے اس خیال سے بھی اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''اعتقادات اور اخلاقیات جو جداگانہ چیزیں ہیں جس کے اعتقاد اچھے ہوں، اس کے اخلاق بھی اچھے ہوں یہ ضروری نہیں۔ اسی طرح جس کے اخلاق اچھے ہوں اس کے اعتقاد بھی درست ہوں ضروری نہیں۔ اعتقادات کا تعلق ہمارے دل سے ہے ہماری روح سے ہے اور خدا سے ہے اور

ہمارے خیالات سے ہے۔۔۔

جب کہ دوسرے کا تعلق یعنی اخلاقیات ہماری ظاہری حرکات اور جذبات سے ہے انسان سے ہے اور اس کے سماج سے ہے۔"

مسٹر ایڈیسن اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ مذہب جو اخلاق اور اعتقاد پر منقسم ہے ان دونوں میں خاص خاص خوبیاں پائی جاتی ہیں مگر پھر بھی اخلاق کو اعتقاد پر اکثر باتوں میں افضل سمجھا جاتا ہے۔مسٹر ایڈیسن کے مطابق مندرجہ ذیل باتوں پر "اخلاق" کی اہمیت بنی رہتی ہے۔

ا۔اخلاق کی اکثر باتیں اتنی صحیح اور مضبوط ہیں کہ اگر اعتقاد بالکل قائم نہ رہے تب بھی اخلاق کی باتوں کی اہمیت باقی رہے گی۔

۲۔جس شخص میں اخلاق اور اعتقاد نہیں وہ اس شخص کی بہ نسبت جس میں اعتقاد ہے پر اخلاق نہیں۔اس دنیا میں انسانوں کے لئے بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔

۳۔اخلاق انسان کی فطرت کو زیادہ کمال بخشتا ہے کیوں کہ اس سے دل کو قرار و آسودگی ہوتی ہے۔دل کے جذبات اعتدال پر رہتے ہیں اور انسانوں کی خوشی کو ترقی ہوتی ہے۔

۴۔دنیا کی تمام مہذب قومیں اخلاق کے بڑے بڑے اصولوں پر متفق ہیں۔گو اعتقادات کے اعتبار سے چاہے وہ کیسے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

۵۔کہا جاتا ہے کہ بداخلاق کفر سے بھی بدتر ہے کیوں کہ ایک نیک چلن آدمی جو جاہل ہو وحشی ہو، جس کو خدا کی باتوں کی کچھ خبر نہیں، کبھی نہ کبھی نجات پاسکتا ہے۔اس کے برعکس ایک بدچلن معتقد آدمی کبھی نجات نہیں پاسکتا۔

۶۔اعتقاد کی خوبی اس میں ہے کہ اس کا اثر اخلاق پر پڑے کیوں کہ مذہب تو انسان کو نیک بنانے کے لئے ہی ہے۔

اس سے آگے مسٹر ایڈیسن لکھتے ہیں کہ مذہب کی خوبیاں ان باتوں میں چھپی ہوئی ہیں:

۱۔اخلاق کی باتوں کو سمجھنا اوران کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانا۔

۲۔نیک اخلاق پر عمل کرنے کے لئے اغراض و مقاصد کا پیدا کرنا۔

۳۔خدا کی نسبت عمدہ خیالات پیدا کرنا اور اپنے ہم جنسوں سے اچھا برتاؤ کرنا۔

۴۔برائی کی برائیوں کو بیان کرنا۔

۵۔نجات کے لئے نیک اخلاق کو عام ذریعہ ٹھہرانا۔مذہب کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے مسٹر ایڈیسن یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک اخلاق میں کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ عیسائی مذہب کا سہارا نہ لے۔مگر سرسید اسی کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی اعتقاد یا مذہب سچا ہو ہی نہیں سکتا۔جس کا نتیجہ اخلاق کی عمدگی پر نہ ہو۔پس اخلاق کو کسی مذہب کا کچھ سہارا درکار نہیں بلکہ مذہب یا اعتقاد کے سچ سمجھنے کے لئے اخلاق کا سہارا ضروری ہے۔

مسٹر ایڈیسن مذہب کے متعلق ایک دو اصول اور بتلاتے ہیں جس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہیں ہوسکتا۔۔۔۔

ہم کو ایسی باتوں پر اعتقاد کی جڑ تسلیم کرنا چاہیے جس سے ہمارے اخلاق مضبوط ہوں اور ہمارے اخلاقیات میں ترقی ہو۔

کوئی اعتقاد صحیح اصولوں پر ہو ہی نہیں سکتا جس کے اخلاق خراب ہوں یا ان میں تنزل ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ مسٹر ایڈیسن یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے مذہب پر قائم رہنے کے علاوہ بعض دوسری باتوں سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔مثلاً اپنے ایمان کو مضبوط کرنے اور ثواب حاصل کرنے کی غرض سے لوگوں کو ایذا اور تکلیف پہنچانا لوگوں کے دلوں میں نفرت و عداوت پیدا کرنا۔جس چیز پر ان کو اعتقاد نہیں زبردستی ان سے قبول کروانا۔یہ سب ایسے مسئلے ہیں جو مشکوک اور قابل اعتراض ہیں۔ان سے اخلاق خراب ہوتے ہیں (یہ ساری باتیں مسٹر ایڈیسن نے اس لئے لکھی ہیں کہ اس زمانے میں عیسائی مذہب کے رومن کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ فرقہ میں بڑی دشمنی کی آگ لگی ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو تکلیف دینے

اور تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے)

سر سید لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں جہاد کے مسئلے کو اس سے مشابہ نہ سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ کہ مسلمانوں کے کچھ ظالم بادشاہوں نے ایسا کیا ہو مگر دراصل 'جہاد' کا مسئلہ اس سے بالکل الگ ہے کیونکہ وہ اخلاق کے خلاف نہیں ہے وہ تو صرف ایک نیشنل لا یعنی اس قانون پر موقوف ہے جو مختلف قوموں کو آپس میں برتنا چاہئے۔ اور آج دنیا کے بہت سے مہذب قوموں میں یہ جاری ہے۔

مسٹر ایڈیسن اپنے مضمون اخلاق کو کسی مصنف کے بہت عمدہ اور دل میں اثر کرنے والے کلام پر ختم کرتے ہیں۔

''آپس میں نفرت پیدا کرنے کے لئے تو ہمارے لئے مذہب کافی ہے۔ مگر ایک دوسرے میں محبت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔''

سر سید اس قول کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے زمانے میں مذہبیوں کا یہی برتاؤ ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کا برتاؤ سب سے برا ہے۔ مگر اسلام کا صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ خدا کو ایک جاننا اور ماننا چاہئے۔ تمام انسانوں کو اپنا بھائی سمجھنا اور بھائی چارگی کو اپنانا چاہئے اور جو ان باتوں کو نہیں مانتا اور اس مسئلہ کے برخلاف ہے وہ یقیناً غلطی پر ہے۔

2.9 مضمون ''کاہلی'' کا خلاصہ

سرسید اپنے زمانے کے ایک زبردست مصلح اور قومی رہنما تھے ان کی ہر بات ہندوستانیوں کے لئے اور خاص طر پر مسلمانوں کے لئے ایک پیغام نو کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مضمون 'کاہلی' میں بھی یہ بات بتلائی گئی ہے کہ مسلمانوں کو ہمہ وقت کام میں لگے رہنا چاہئے۔ خالی ذہن شیطان کا اڈا تو ہوتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی اس وقت ہوسکتی ہے جب وہ علم کے میدان میں ترقی کریں اور اپنے دل و دماغ سے کام لیں۔ دل و دماغ اس وقت کام کرتے ہیں جب ان کا استعمال ہوتا ہے ورنہ آدمی کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ اس طرح جو اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے وہ ترقی کے راستے سے بہت دور ہو جاتا ہے۔

سرسید کہتے ہیں کہ 'کاہلی' صرف ہاتھ پاؤں کی حرکت یعنی اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں سستی کا نام نہیں بلکہ یہ بھی کاہلی ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو کام میں نہیں لگائے بغیر بیکار چھوڑ دے۔

دنیا کی تاریخ ہر دور میں محنت کرنے والے طبقہ میں کاہلی نام کی کوئی چیز نہیں۔ ان کی صبح محنت مزدوری سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے انہیں روزی روٹی ملتی ہے اور اس پر ان کی بسر اوقات ہوتی ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب کے سب صبح سے شام تک سخت سے سخت کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ جس سے ان کو پیٹ بھر روٹی ملتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس 'کاہلی' نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔۔۔ مگر ہمارے یہاں بہت سارے پڑھے لکھے آدمی ایسے ہیں جو کوئی کام نہیں کرتے ان کی علمیت اور عقلیت پر کوئی شک نہیں مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں علم اور اپنی عقل کو کام میں لگائے رکھنے کا کوئی موقع ہی نہیں۔ اسی لئے وہ اپنے دل و دماغ کو کسی کام میں مصروف رکھنے کے بجائے بیکار چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی علمیت کو زنگ لگ جاتا ہے اور وہ لوگ سست و کاہل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات اس شخص کے ذہن میں پست اور برے خیالات جنم لیتے ہیں وہ شراب، قمار بازی اور قماش بینی

کا عادی ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے لئے آمدنی کے اعتبار سے محنت مزدوری کی ضرورت نہیں رہتی۔ دماغی کام کاج کرنے کے لئے کوئی موقع نہیں، پھر کیوں نہ اس کا ذہن عیش پرست ہوجائے۔

سرسید اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے اور اس بات کو مانتے بھی تھے کہ ہندوستان میں پڑھے لکھے ہندوستانیون کے لئے ایسے مواقع بہت کم ہیں کہ وہ اپنے قوائے دل اور قوت عقل کو کام میں لائے اور اپنے عقلی جوہر دکھائے۔ اس کے برخلاف ولایت میں اور خاص طور انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ وہاں لوگ اپننے اپنے دل ودماغ کو کام میں لاکر علمی کام کرتے رہے۔

سرسید اس مضمون کے آخر میں سب ہندوستانیوں کو اس بات کی طرف متوجہ کراتے ہیں اور انہیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ اگر چہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کو اپنے قوائے دل اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں۔ پھر ہم کو چاہئے کہ ہم اس بات کی فکر اور کوشش میں رہیں کہ ہمیں یہ موقع کیوں کر حاصل ہو۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کوئی قصور ہے؟ ہماری کوئی کمی ہے تو اسی بات کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے کہ وہ کمی اور قصور کس طرح دور ہو؟

ڈھونڈنے والے کو خدا بھی ملتا ہے۔

ہمیں اس کوشش میں لگے رہنا چاہئے کہ ہمیں بھی وہ موقع حاصل ہو جس سے ہم اپنے جوہر علم کو ظاہر کرسکیں کسی حال میں بھی ہم اپنے دل ودماغ کو بیکار نہ چھوڑیں۔ کیوں کہ سرسید کا خیال ہے کہ جب تک ہماری قوم کے پڑھے لکھے لوگوں کے دل ودماغ سے یہ 'کاہلی' اور بے کاری نہ جائے گی اس وقت تک ہماری قوم کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

2.10 مضمون ''ریا'' کا خلاصہ

'ریا' اور'ریا کاری' اس کام کو کہتے ہیں جس میں کام کی کوئی حقیقت یا اصلیت نہیں ہوتی بلکہ صرف ظاہرداری ہوتی ہے۔

سرسید کا خیال ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ عام ہیں جن کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے میں کچھ نظر آتے ہیں اور حقیقت میں کچھ اور ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اتنے بد اور برے ظاہر کرتے ہیں جتنے کہ وہ برے نہیں ہوتے اور اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو ایسے نیک ظاہر کرتے ہیں جتنے وہ نیک نہیں ہوتے۔ اصل میں نیکی تو تقوی اور پرہیزگاری کا دوسرا نام ہے۔ ان لوگوں کے پاس مذہبی ظاہرداری ہوتی ہے مگر وہ تقوئ جو مذہب کی روح ہے، ان کے پاس نہیں ہوتی۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے علاوہ لوگوں کی ایک تیسری قسم بھی بتائی جاسکتی ہے جو ان دونوں سے بالکل الگ ہوتی ہے اور وہ سب سے زیادہ قابل رحم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ اپنی ظاہرداری سے لوگوں کو دھوکہ اور فریب نہیں دیتے بلکہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں ان کی ظاہرداری اور بناوٹ خود ان سے انہی کے دل کے حال کو چھپاتی ہے جس قدر کہ وہ نیک ہیں۔ اس سے زیادہ ان کو نیک بتاتی ہے پھر وہ اپنی بدیوں کو نیکیاں سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ جو لوگ اعلانیہ برائی کرتے ہیں ان کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے نصیحت کی جاتی ہے۔ مگر جو لوگ اس طرح کے دھوکہ میں پھنسے ہوئے ہوں کہ بدیوں کو نیکیاں سمجھیں اور خود ان کے دل میں چھپے برائیوں کا انہیں احساس نہ ہو تو ان کو کس طرح بچایا جاسکتا ہے۔ وہ کس قدر رحم کے محتاج ہیں، نہ کوئی یہ بتاسکتا ہے کہ ان کی غلطیاں کیا ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی غلطی پر ہیں ----

اس طرح ان کے دل میں چھپی ہوئی برائیاں انہیں تباہی و بربادی کے راستے پر ڈال دیتی

ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک جامع اور بڑے اچھے الفاظ میں دعا مانگی تھی کہ

"اے خدا! کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں اور گناہوں سے پاک کر۔۔۔"

اس قسم کی دعائیں مانگتے ہوئے ہمیں اپنے دلوں کا حال بھی جانتے رہنا ضروری ہے تا کہ ہم ایسے دل میں چھپے ہوئے پوشیدہ گناہوں کا صفایا کر سکیں۔ اس کے لئے انسانوں کو ان مذہبی اصولوں کا پابند کر لینا چاہیے جو ہماری ہدایت کے لئے کتاب مقدس (قرآن) میں لکھے گئے ہیں۔ اور پھر ہماری ہدایت کے لئے ہمارے سامنے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ جن کی زندگی کا ہر عمل آئین خداوندی ہے۔ اور ہمارے لئے ہدایت اور نجات کا راستہ۔ کتاب اللہ اور نبی ﷺ کامل سے بڑھ کر ہمارے لئے ہدایت کا کوئی ذریعہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر ہم سے ان دونوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی سمجھ کی غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ تو اختلاف رائے ہوتا ہے۔ جو ہمارے مذہبی رہنماؤں کا شعار اور عام طریقہ ہو گیا ہے۔ اس لئے دلوں کے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ طریقہ سرسید یہ بتلاتے ہیں کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست تو اکثر ہمارے مزاج کے مطابق ہماری تعریف کرتے ہیں ہمارے تو انھیں عیب ہی نہیں معلوم ہوتے یا پھر ہمارے دل رکھنے کے لئے ان عیبوں کو چھپا دیتے ہیں اور ہم پر ظاہر نہیں کرتے۔ اگر ظاہر کرنا بھی چاہیں تو کچھ ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ہمیں وہ باتیں بالکل معمولی معلوم ہوتی ہیں اور ہم ان پر توجہ نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف ہمارے دشمن ہمیں خوب ٹٹولتے ہیں اور ہر جہت سے ہمارے عیب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ کہ دشمن کبھی کبھی بہت چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی بڑا کر دیتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ چاہئے کہ اس میں کچھ نہ کچھ اصلیت تو ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں دوست اور دشمن دونوں کی ضرورت ہے۔ دوست تو ہر حال میں دوست ہے اور ہمیشہ

کام آتا ہے، مگر ہمیں اپنے دشمن کا بھی احسان مند رہنا چاہئے کہ وہ ہمیں ہمارے عیبوں سے آگاہ کراتا ہے۔ ان عیبوں کو جاننے کے بعد ہم ان عیبوں سے باز آ گئے تو گویا ہمیں دشمن سے وہی چیز ملی جو ایک اچھے استاد سے کسی انسان کو ملتا ہے۔ دشمن جو بھی عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے وہ فائدے سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ اگر وہ عیب ہم میں ہین تو ہم ان سے پاک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ عیب ہم میں نہیں ہے تو بھی ہم اپنے دل کو ٹٹولتے ہیں، جانچتے ہیں اور پھر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں ہیں۔ پلوٹارک، کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے:

''دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے چال وچلن میں اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہو سکتے۔''

اسی طرح اگر ہم اپنے آپ کو سمجھنا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ہمارے دوست ہمیں کیا کہتے ہیں ہمارے دشمن ہمیں کیا کہتے ہیں اور ان دونوں کی جو رائے ہمارے بارے میں ہے ان میں سے کون کون سی باتیں ہماری ذات میں پائی جاتی ہیں اور کون کون سی باتیں صرف دل جوئی اور دشمنی کی بنا پر کہی گئی ہیں اس کے علاوہ ہمیں اس نیکی پر بھی زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہئے جس میں شک کی کوئی گنجائش ہو بلکہ ان لوگوں کی رائے کی بھی قدر و منزلت کرنی چاہئے جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ عقل منداور نیک دل بھی ہیں اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کرتے ہیں اس طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اختلاف رائے کا ہونا قدرتی ہے مگر کیا اختلاف کرنے والے نے اپنی آزادی رائے کا اظہار کیا ہے یا یہ رائے کسی بیرونی دباؤ یا رسم و رواج یا تعصب وتقلید میں تو نہیں کیا ہے۔ جس کام کے کرنے میں عقل کے علاوہ اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو اس کے کرنے میں عقل مند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا اور اس پر شک کرنا چاہئے کہ ضرور اسی میں کوئی نہ کوئی برائی چھپی ہوئی ہوگی۔

الغرض ان باتوں پر غور کرتے ہوئے ریا کاری سے بچنے کے لئے اپنے خیالوں کو جانچنا اور اپنے دل کو ٹٹولنا اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا، اس سے بڑھ کر ہمارے لئے کوئی چیز مفید نہیں۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی نیکی کو مضبوطی کے ساتھ جگہ دیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آئے۔ جس دن کہ ہمارے بھیدوں کو جاننے والا ہمارے دلوں کو جانچے گا۔ تو ان اصولوں پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں ہمارے بانی اسلام حضور ﷺ نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریا کاری کی برائی کو بتلا دی جس سے انسان دنیا کو دھوکہ دیتا ہے اور خود اپنے آپ کو بھی فریب میں ڈالتا ہے۔ ریا کاری سے بچنے کے لئے حضور ﷺ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ خدا کو ہر جگہ حاضر و ناظر جاننا چاہئے جو ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے۔

2.11 مضمون ''تکمیل'' کا خلاصہ

اس مضمون کا نفس موضوع یہ ہے کہ جب کوئی شخص یا قوم اپنے آپ کو بلندی کے سب سے اعلی درجہ پر سمجھے وہیں سے اس کے زوال کی شروعات ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو کامل سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے کیوں کہ اس طرح سوچنے کے ساتھ ہی اس میں سعی اور کوشش کی تمام راہیں رک جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس چیز میں جس کو وہ کامل سمجھتا تھا زوال آ جاتا ہے۔

سرسید کا کہنا ہے کہ کامل مطلق تو صرف ذات باری تعالیٰ ہے اور کوئی کامل ہو ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا اور جو کچھ اس نے کہا وہ تو اپنی قسم میں کامل ہے مگر اس کے علاوہ جو کچھ انسان نے کیا اور جو کچھ انسان نے کہا وہ تمام کا تمام ترمیم کے لائق ہے۔ کیوں کہ انسان تو خطاؤں کا پتلا ہے اس لئے ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں یا نتائج عقل انسانی میں ان کو کامل سمجھ لینا ہماری سب سے بڑی غلطی ہے۔

کسی شخص یا قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا ہی بہت سی خرابیوں اور نقصانات کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً ایسے شخص کی ساری قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں جو اپنے آپ کو کامل سمجھنے لگتا ہے اس میں کسی چیز کو نئے طور پر سوچنے سمجھنے کی قوت چلی جاتی ہے اور وہ لوگوں کے ان اعتراضات کو بھی سننا پسند نہیں کرتا جس سے خود اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ وہ اسی بھروسہ میں جیتا ہے کہ اس کا کیا ہوا اور اس کا کہا ہوا بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں سدھار کی بالکل ضرورت نہیں۔

خدا نے ہمیں جو عقل دی ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کو سوچنے سمجھنے کے کام میں لایا جائے نہ کہ بیکار چھوڑ دیا جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو کامل یا کسی چیز کو مکمل سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے تو وہ دراصل اپنے آپ کی سوچنے کی قوت کو ضائع کر کے خود اپنا ہی نہیں بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کا بھی نقصان کرتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے اسی نقص کے ذریعے جو نقصان دینی و دنیاوی اٹھائے ہیں اس کی کچھ انتہا نہیں۔ مسلمانوں کے اس بے حساب نقصانات کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ ارسطو کے فلسفہ الہیت اور بو علی سینا کی طب کو حرف آخر مانا جاتا تھا۔ ان کا علم اپنے زمانے میں لاجواب تھا۔ اس میں چوں چرا کرنا پاگل پن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس علم کے میدان میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ ان کو کہیں پیچھے چھوڑا جاسکتا ہے۔ یہ سب انسانی سوچ اور عقل کی وجہ سے ہے لیکن اگر انسان ان کے علم کو تکمیل علم سمجھ کر ہار مان لیتا تو آج ان علوم میں اتنی ترقی نہیں ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو قدرت کے نمونے ہیں اور روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جارہی ہیں یہ سب کچھ انسانی سوچ اور تحقیقات کی دین ہے ورنہ انسان آج بھی اسی مقام پر کھڑا رہ جاتا جہاں کل کھڑا تھا۔

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہر دور میں دو قومیں نظر آئیں گی ان میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کے کارناموں کو آسمانوں کی بلندی پر سمجھا جہاں آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان کو ہر طرح کے خطاؤں سے پاک سمجھا اور ان کی پیروی پر جمے رہے۔ زمانے کی ترقی اور تبدیلی پر نئی چیزوں کی ایجاد پر اور پرانے سرمایہ میں کچھ اضافے یا ترمیم کی کوشش نہیں کی۔ اور دوسری طرف دوسری قوم نے کسی کو کامل مطلق نہیں سمجھا، کسی کو بھی آسمان کی بلندی پر نہیں بٹھایا وہ ہمیشہ ترقی کی سوچتے رہے۔ نئے نئے علوم وفنون اور طریق معاشرت کی ایجادوں پر ان کی نظر رہی۔ ان دونوں قوموں میں کیا فرق ہے۔ ان میں سے کون تنزل پر ہے اور کون ترقی پر ہے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں۔

ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو اپنے آباواجداد کے کارناموں اور علمی ورثے کو کامل مطلق سمجھ کر اس پر چلتی رہیں اور انگریز، فرنچ و جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش اور راہ پر لگی رہیں ایک زمانہ تھا کہ یہ ایشیائی قومیں (ہندو اور مسلمان) علم و ہنر اور شائستگی میں اپنے دور میں اپنے ہم عصر قوموں سے مقدم اور اعلی سمجھی جاتی تھیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کی وہ عزت تھی کہ یورپ کی بعض قوموں کے مقابلے میں ایک عزت دار قوم سمجھی جاتی تھی۔ مگر آج مسلمانوں کی کیسی بدنامی ہے۔

مسلمانوں کوتو اللہ تعالی کی طرف سے کیسے اچھے قوانین اور آداب معاشرت دیئے گئے ہیں۔ مگر ہم نے ان کا صحیح استعمال نہیں کیا اور آج ہم اس (اسلام) کو ایسا مسخ کر دیا کہ آج غیر قومیں اسلام کو کیسی حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں۔ اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں جس کو دیکھ سکے، مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال وچلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے چال وچلن سے اس کو ایسا بدصورت کر دیا ہے کہ لوگ، اس سے نفرت کریں تو کوئی تعجب نہیں۔ پس مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو کامل نہ سمجھیں (اگرچہ کہ دین اسلام ایک دین مکمل ہے) اور اپنے اخلاق کی شائستگی پر غور کریں۔ اپنے چال و چلن کو درست کریں اور اپنے آپ میں وہ اخلاق حمیدہ پیدا کریں کہ اسلام کی اصلی صورت سامنے آسکے اور وہ دنیا کو بتلاسکیں کہ مسلمان ایک شائستہ اور عمدہ اخلاق رکھنے والی زندہ قوم ہے۔

2.12 خوشامد

(متن)

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہوجاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادّہ پیدا ہوجاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آئند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہوجاتی ہے۔

اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کرا اپنے دل کو خوش کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہی محبت ہم سے باغی ہوجاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اسقدر قدر کرتے ہیں جب کہ ہمارا دل ایسا نرم ہوجاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہوجاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہوجائے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ جذبہ ہے

پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جب کہ ہم کو ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہیں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بجائے جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جائیں کیوں کہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہوسکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست و چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک رونی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اس طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے۔ جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال وخط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی

تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہوجاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا۔مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کردیتی ہے۔فیاض آدمی کو بدنامی اور سیہ [illegible] ی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔جولوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

☆☆☆

2.13 نمونہ امتحانی سوالات:

ا۔سرسید کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالئے۔

۲۔سرسید کی مضمون نگاری کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

۳۔مضمون 'امید کی خوشی' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۴۔مضمون 'تعلیم وتربیت' سے متعلق سرسید کے خیالات کا احاطہ کیجیے۔

۵۔مضمون 'رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات' کی نشاندہی کیجیے۔

۶۔مضمون 'اخلاق' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۷۔مضمون 'کاہلی' سے متعلق اپنی معلومات سپرد قلم کیجیے۔

۸۔مضمون 'ریا' کے بارے میں سرسید کے خیالات کا نچوڑ پیش کیجیے۔

۹۔مضمون 'تکمیل' کا مفہوم بیان کیجیے۔

۱۰۔مضمون 'خوشامد' کا مرکزی خیال واضح کیجیے۔

اکائی نمبر:3   افاداتِ مہدی

ساخت:

3.0 اغراض ومقاصد
3.1 تمہید
3.2 مہدی افادی کے سوانحی احوال
3.3 مہدی افادی کی سیرت وشخصیت اور مصاحب ومشاغل
3.4 مہدی افادی کے طرز انشاء کی خصوصیات
3.5 نمونہ امتحانی سوالات
3.6 فرہنگ

3.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کومکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ

☆ مہدی افادی کے سوانحی احوال سے واقف ہوسکیں
☆ مہدی افادی کی سیرت وشخصیت سے متعلق جانکاری حاصل کرسکیں
☆ مہدی افادی کے مناصب ومشاغل اوران کے مصاحبین کے بارے میں جان سکیں
☆ مہدی افادی کی روشنی میں مہدی افادی کے طرز انشاء کی خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں

3.1 تمہید:

اس اکائی میں ہم مہدی افادی کے سوانحی حالات سے متعلق تفصیل سے بتائیں گے۔مہدی افادی کی سیرت وشخصیت پر روشنی ڈالیں گے نیز ان کی سرکاری مصروفیات کے ساتھ ان کے مصاحبین کا بھی تذکرہ کریں گے جن سے ان کے قریبی مراسم تھے۔آخر میں ان کے مضامین کا مجموعہ'افاداتِ

مہدیؔ کی روشنی میں ان کے طرز انشاء کی خصوصیات اور محاسن اجاگر کریں گے تاکہ اردو نثر نگاری میں ان کا مقام و مرتبہ متعین کیا جاسکے۔

3.2 مہدی افادی کے سوانحی احوال

مہدی افادی اردو ادب کے مایہ ناز ادیب اور صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔ مہدی افادی کا اصل نام مہدی حسن تھا۔ وہ گورکھپور کے ایک علمی اور شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شیخ حاجی علی حسن مرحوم کورٹ انسپکٹر تھے۔ مہدی افادی جب 19-18 سال کے ہوئے تو ان کی شادی گورکھپور ہی کے ایک خاندان سادات کی لڑکی سے ہوئی جس سے تین اولادیں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوا۔ پہلی بیوی زیادہ دن زندہ نہ رہی وہ ۱۹۰۴ء کو وفات پاگئی۔ یہ حادثہ ان کے لئے کوئی معمولی نہیں تھا اس پر ننھی جانوں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھالی گویا ایک بڑی ذمہ داری کا کام تھا جسے مہدی افادی نے جس جاں نثاری اور وفاداری سے نبھایا اور اپنی بے ماں کی اولاد کی جس طرح اعلیٰ تربیت کی ان کی نظیر بہت کم ملے گی۔

مہدی افادی نہایت دیانت دار اور ایک معزز با اثر شخصیت کے مالک تھے۔ انگریز حکام میں آپ کو بہت کچھ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ لکھنا پڑھنا، کھانا پینا، غسل و تفریح وغیرہ ان سب میں وقت مقررہ کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے۔

۱۸۹۶ء میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ ہی سالوں میں عاملانہ عہدوں پر چنار اور مرزاپور وغیرہ میں رہے۔ اس کے بعد نائب تحصیل دار کے عہدہ پر فائز ہوکر بنارس آئے۔ ۱۹۰۹ء میں تحصیلداری کی قائم مقامیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور الہ آباد میں صدرِ تحصیل دار کے معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ مہدی افادی بالطبع غیر شریفانہ مسائل سے دلچسپی نہیں تھی اسی لئے عام لوگوں سے ان کی ہمیشہ دوری رہی۔ وہ صرف ایسے شخص سے دوستی رکھ سکتے تھے جو اصولاً، اخلاقاً، عقلاً اس قابل ہوتا۔ اس کے

ساتھ اس کا علم دوست ہونا ضروری تھا۔ اسی وجہ سے وطن میں بھی ان کا دائرہ احباب وسیع نہیں تھا۔ تاہم یہی کافی تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہمیشہ خاص طرح کا خلوص، وضعداری اور یک رنگی رکھتے تھے جسے آخر وقت تک نبھایا۔

مہدی افادی انگریزی کے ساتھ عربی اور فارسی کے بھی بڑے شائق تھے۔ اسلامی لٹریچر اور اس کے متعلقات پر یورپ میں جو تصانیف انگریزی یا کسی مشرقی زبان میں شائع ہوئی تھیں وہ خصوصیت کے ساتھ ان کے پیش نظر رہتی تھیں۔ ان کی لائبریری اپنے دور کے بہترین لٹریچروں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔ اردو ادب کا نہایت لطیف اور صحیح مذاق رکھتے تھے اور انشاء پردازی تو گویا ان کا حصہ تھی۔ کتب بینی ان کے لئے شرط حیات تھی۔ معمولاً شب کے چند گھنٹے پڑھنے میں ضرور صرف کرتے اور اسے تمام دن کی دماغی محنتوں کا بہترین معاوضہ سمجھتے تھے جس روز کوئی نئی کتاب نہ ہوتی تو پرانی کتابوں سے کام چلا لیتے۔ ان کی لائبریری میں جتنی کتابیں ہیں وہ سب بارہا ان کی نگاہ سے گذر چکی ہیں۔ تواتر مطالعہ سے کتابوں کے خاص خاص حصے ان کو حفظ ہو گئے تھے۔ پڑھنے کی رفتار تیز بہت تیز تھی۔ ضخیم سے ضخیم کتاب دونشست میں ختم کر دیتے تھے، کتابیں اس قدر ان کو عزیز تھیں کہ زمانہ علالت میں بھی وہ ان سے قطع نظر نہیں کر سکتے تھے۔

3.3 مہدی افادی کی سیرت وشخصیت اور مصاحب ومشاغل

وہ جہاں خلیق تھے وہاں خوددار بھی حد درجے کے تھے وہ اپنے سے کم رتبہ احباب سے ملتے اور بازدید کے لئے اس کے گھر بے تکلف جاتے لیکن کسی کے ہاں وہ گئے اور بازدید کو نہ آئے چاہے کتنا ذی مرتبہ کیوں نہ ہو پھر دوبارہ اس سے ملنے نہیں جاتے تھے۔ وہ نہایت نیک نیت تھے اور صداقت ان کی طبیعت کا ایک زبردست جزو تھی۔ خصوصاً دل تو سینہ میں ایک شفاف آئینہ تھا ناممکن تھا کہ اپنے متعلقین میں کسی طرف سے ہو اور کسی حیثیت سے ہو، ذرا سا میل اس پر آ جاتا تو وہ اسے برداشت

کر سکتے طبیعت میں ایک ایسی بے چینی پیدا ہو جاتی تھی جس سے رات کو چین سے سو بھی نہیں سکتے تھے جب تک کہ اس سے صفائی نہ کر لیتے اور جس کے ساتھ جتنا ہی گہرا تعلق تھا اتنا ہی زیادہ اس کا اثر بھی قبول کرتے تھے۔

مہدی افادی اپنے اصحاب کے علمی مذاق کے بہت گرویدہ تھے دل سے قدر اور محبت کرتے تھے اور اس ارتباط کو انہوں نے آخری آخری وقت تک نبھایا۔ اپنے ادبی احباب میں جن کی لٹریری اور علمی قابلیت کے وہ دلدادہ تھے مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام نامی سرفہرست تھا۔ آپ کے ساتھ انہیں سچا خلوص اور دلی تعلق تھا۔ آپ کے خطوط کا ان کو بے چینی کے ساتھ انتظار رہا کرتا تھا جس روز ڈاک میں آپ کا خط ہوتا تھا انہیں بے حد مسرت ہوتی تھی۔ خدا جانے کتنی مرتبہ اسے پڑھتے تھے اور سیری نہیں ہوتی تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات پر جو تعزیت نامہ ''ہمدم'' میں شائع کرایا تھا۔ اس کا ایک ایک حرف بجائے خود باہمی خلوص اور سچی محبت کا بہترین ثبوت ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کے علاوہ سید ناصر علی، ایڈیٹر صلائے عام، مولانا محمد علی جوہر، شاہ دلگیرا کبر آبادی اور مولانا شبلی سے بھی خاص مراسم تھے۔ خط و کتابت کے معاملے میں مہدی افادی بڑی احتیاط برتتے تھے۔ بلکہ مراسلت ان کی زندگی کا نہایت ضروری جزو تھی۔ ڈاک کا ان کو روزانہ انتظار رہا کرتا تھا۔ جس روز اردو کا کوئی نیا رسالہ ہوتا اس روز انہیں روحانی مسرت ہوتی یا جب ان کی لٹریری دوستوں میں سے کسی کا خط آتا تو بہت خوش ہوتے اور اس خط کو بار بار پڑھتے۔ خود خط لکھنے اور دوسروں کے خطوط کا جواب دینے میں بہت باقاعدہ تھے۔ خط کا جواب نہ دینا ان کے نزدیک ایک اخلاقی جرم تھا جس کے وہ مرتکب نہیں ہوئے۔ خط خواہ وہ کسی کا ہوتا جواباً ضرور اس کو لکھتے۔ یہاں تک کہ زمانہ علالت میں بھی مراسلت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ آپ نہیں لکھ سکتے تو اپنے فرزند احمد حسن سے لکھواتے اور خود بولتے جاتے تھے۔ عیادت کے خطوط جو روزانہ آتے رہتے تھے ان کا جواب جب تک نہ جاتا ان کو بے چینی رہا کرتی تھی۔ عین وفات کے روز بھی کوئی دو بجے دن کو انہوں نے کئی خط لکھوا کر بھیجے تھے۔ ان کے خطوط میں ایک

خاص ادا ہوتی تھی۔ عبارت حشو و زوائد سے بری ہوتی تھی اور طرز انشا میں وہ اپنا ایک جداگانہ رنگ رکھتے تھے لیکن کسی کے مقلد نہیں تھے بلکہ خود درجۂ اجتہاد رکھتے تھے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ان کے خطوط کی ایک معقول تعداد تعویذ ادب بن کر حرز جان کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔

اردو انشاء پردازی کا یہ درخشاں ستارہ جسے اردو ادب میں اپنے خاص طرز انشاء کے سبب پہچانا جاتا ہے ۴۷ سال کی عمر میں ۱۹۲۱ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے افقِ ادب سے اوجھل ہو گیا۔

3.4 مہدی افادی کے طرز انشاء کی خصوصیات 'افاداتِ مہدی' کی روشنی میں

مہدی افادی اردو ادب کے ان مایہ ناز ادیبوں اور معماروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے مضامین کی بدولت وہ شہرت دوام پائی کہ آج تک ان کی انشاء پرداری کا اسلوب اور انداز کسی اور اہل قلم کو حاصل نہ ہو سکا۔ مہدی افادی اپنے انداز تحریر اور طرز انشا کے خود موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ اگرچہ مہدی افادی کا مطالعہ وسیع اور معلومات کا ذخیرہ غیر معمولی تھا لیکن وہ دنیائے ادب میں اپنے علمی و ادبی مضامین پر مشتمل مختصر مجموعہ ''افاداتِ مہدی'' سے یادگار اور زندہ جاوید ہو گئے۔ یہ مجموعہ مضامین کوئی مرتب کتاب نہیں متفرق مضامین میں جو یکجا کردئے گئے ہیں اس لئے قدرتاً اس میں ترتیب و تالیف کی وہ خصوصیات مفقود ہیں جن کی توقع ہر مرتب کتاب سے ہو سکتی ہے۔ یہ مجموعہ مضامین مہدی افادی کے بعد ان کی رفیق حیات نے اکٹھا کر کے مولانا عبدالماجد دریابادی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۲۳ء میں شائع کیا تھا۔

''افاداتِ مہدی'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس مجموعے کے مضامین کا رقبہ مدت بیس سال تک وسیع ہے یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۹ء تک۔ اس طویل مدت میں انقلابات دہر کے ساتھ خود صاحب مضامین کے خیالات وطرز ادا میں انقلاب ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اہل نظر کو اس کے شواہد مجموعے

میں جابجا ملیں گے اور یہ خصوصیت تو بہت نمایاں ہے کہ آخری مضامین صحت زبان، لطافت خیال، پختگی ترکیب، متانتِ بیان اور شوخیٔ ادا ہر حیثیت سے مضامین سابق سے ممتاز ہیں۔ ''افاداتِ مہدی'' میں تقریباً ۲۴ مطبوعہ مضامین شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً اس دور کے مقتدر اور معیاری رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ ابتدائی پانچ مضامین رسالہ ''البشیر'' میں دو مضامین رسالہ 'مخزن' میں پانچ مضامین رسالہ 'مشرق' میں دو مضامین، رسالہ 'صدائے عام' میں سات مضامین رسالہ 'نقاد' میں اور تین مضامین رسالہ 'معارف' میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے 'تنقیدات عالیہ'، 'اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ'، 'شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر'، 'تمدن عرب پر ایک کھلی جھٹی'، 'شبلی سوسائٹی' اور 'حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک'، اسلوب بیان، فکری بالیدگی، طرز انشاء اور ادبی قدر و قیمت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ افادات مہدی کے مضامین گرچہ طوالت کے اعتبار سے بہت ہی مختصر ہیں لیکن علمیت، افکار کی پختگی اور ادبی طرز فکر کے اعتبار سے بلند پایہ ہی نہیں بلکہ انشاء پردازی کے فن کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔ '' آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ اور غیر ستائش جنبش لب'' جیسے مضامین کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی قاری اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی ترکیبوں کو اردو خواں طبقہ کے لئے مانوس بنا دینا انہی کا کام تھا۔ ذیل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ حسنِ بیان ان پر ناز کرتا ہے اور لطف انشاء ان پر جھوم اٹھتا ہے:

> ''غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔''

یہ اقتباس دیکھئے جس میں انشاء پردازی کی تمام تر فنی خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ اور جسے ہم بلاشبہ بعض اہل قلم کے طویل مضامین پر فوقیت دے سکتے ہیں۔ اردو میں انشاء پردازی کی اس سے بہتر کوئی مثال نہیں کی جا سکتی۔ سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی، حالی اور مولانا آزاد کے تعلق سے جو تعارف مہدی

افادی نے چند جملوں میں پیش کیا ہے اس کا مقابلہ میں سمجھتا ہوں کہ دیگر اہل قلم کے طویل سے طویل تعارفی اقتباس بھی نہیں کر سکتے۔

> ''سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے واقعات بھی انہوں نے جس قدر لکھے ہیں قصص یعنی ٹیلز کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں 'افسانہ یا ران کہن' سمجھئے۔''

> ''سچ کہئے۔ عذرا واقعی بہت حسین ہے۔ حسین تو ایک معمولی اور سہہ سری لفظ ہے۔ عورتیں تو سبھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا۔ عذرا میری عذرا! تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے اس کی آواز کامل موسیقی اور اس کا تبسم عنصر حیات ہے وہ قطعاً توبہ شکن ہے۔ توبہ شکن اور کافر ایمان! ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے جہاں آنکھیں ملیں بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا۔ دل سے آواز آئی خدا یا خیر! جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں۔''

مہدی افادی کی یہ عبارتیں اگر حسن انشاء کا بہترین نمونہ نہیں تو پھر نہیں معلوم انشاء پردازی کا اطلاق کس شئے پر ہوگا۔ مہدی افادی مولانا محمد حسین آزاد کے بعد بلاشبہ اردو کے دوسرے بڑے انشاء پرداز ہیں جن کے مضامین میں فن انشائیہ نگاری کے وہ سارے لوازم متوازن انداز میں جلوہ گر ہوئے

ہیں۔طرز انشاء کی لطافت، تحریر کی دلکشی، حسن بیان کا اچھوتا پن ان کے تمام مضامین میں دیکھا جا سکتا ہے۔بعض مضامین تو فصاحت، برجستگی اور طرز ادا کے اعتبار سے اتنے غیر معمولی ہیں کہ قاری کو مہدی افادی کی قادرالکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''فلسفیوں سے آج تک 'حسن' کی جامع تعریف نہ ہو سکی۔ بہت زور لگا کر بھی اس قدر کہہ سکے کہ حسن ایک طرح کے تناسب اعضا کا نام ہے لیکن آؤ میں تمھیں بتاؤں یہ جو گوری چٹی کشیدہ قامت چھریرے بدن کی کچھ چرائے چھپائے بچتی ہوئی آرہی ہے ذرا غور سے دیکھنا! اندھیرے میں بھی اس کا چہرہ کتنا چمک رہا ہے یہ جیتی جاگتی 'زہرہ شب' تمھارے دل میں جگہ پائے گی کچھ معلوم بھی ہے کون ہے۔غور سے دیکھو وہ بہترین عطیۂ فطرت جسے شعراء دفینۂ حسن کہتے ہیں اور آج کل کی اصطلاح میں آپ مخزن جذبات کہیے۔''

اس اقتباس میں حسن انشاء پردازی کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ڈرامائی کیفیات کے اظہار نے اسے اتنا پرتاثیر بنا دیا ہے کہ قاری اسے صرف محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کے اثرات اس کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔مہدی حسن افادی کی غیر معمولی انشاء کی صلاحیتوں کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندوی کو یہ کہنا پڑا کہ وہ ایک سحر نگار ادیب اور ایک خاص طرز انشا کے موجد تھے۔اور ادب و انشاء کا ایسا ذوق سلیم رکھنے والا ادیب مدتوں میں پیدا ہوتا ہے۔مہدی افادی کا یہ خاص وصف رہا ہے کہ وہ مروجہ روش سے ہٹ کر بات کرتے تھے۔سماجی یا اخلاقی قیود سے ڈر کر اپنے تاثرات کے اظہار میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ان کے یہاں عرفانِ محبت بھی ہے اور نیرنگی حسن کی داد دینے کی صلاحیت بھی۔نئی نئی ترکیبیں گھڑنے اور انگریزی سے اردو میں نئے نئے لفظ ایجاد و اختراع کرنے میں مہدی افادی کو ملکہ حاصل تھا اور اگر کہیں علمی استعداد ڈپٹی نذیر احمد کی سی ہوتی یا لسانیات اور زبان دانی سے مناسبت محمد حسین آزاد کی سی تو مہدی افادی ان دونوں میدانوں میں سب سے بازی لے جاتے اور

اپنے معاصرین کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے پھر جتنا کچھ وہ کر گئے بہت سے پیشہ ور اور مستند مصنفین کے لئے بھی باعث رشک ہی ہو سکتا ہے۔

مجموعی طور پر مہدی افادی اردو کے صفِ اول کے انشاء پرداز کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مجموعہ مضامین 'افادات مہدی' اردو کے طرز انشا کا ایک قابل قدر سرمایہ ہے جسے اردو انشاء پردازی کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

3.5 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ مہدی افادی کے سوانحی احوال پر روشنی ڈالئے۔

۲۔ مہدی افادی کی سیرت و شخصیت بیان کرتے ہوئے ان کے مشاغل و مصاحبین کے بارے میں اظہار خیال کیجئے۔

۳۔ افادات مہدی کی روشنی میں مہدی افادی کے طرز انشاء کی خصوصیات بیان کیجئے۔

۴۔ افادات مہدی سے کسی ایک مضمون کا فکری و فنی جائزہ لیجئے۔

3.6 فرہنگ:

حکام	:	حکومت کرنے والے افسران - حاکم کی جمع
کتب بینی	:	کتابیں پڑھنا - کتابوں کا مطالعہ
تواتر	:	لگاتار، مسلسل۔
انشاء پردازی	:	مضمون لکھنے کا طریقہ یا انداز
بازدید	:	جوابی ملاقات
ارتباط	:	ملنا جلنا، تعلقات
مراسلت	:	باہمی خط و کتابت
شواہد	:	گواہ، ثبوت، شاہد کی جمع
فوقیت	:	برتری
قصص	:	قصے، قصہ کی جمع
معاصرین	:	ہم زمانہ لوگ - معاصر کی جمع

اکائی نمبر:4   قواعد(Grammar)

ساخت:

4.0 اغراض ومقاصد
4.1 تمہید
4.2 اسم اوراس کی قسمیں-اسم خاص اوراسم عام
4.3 ضمیراوراس کی قسمیں
4.4 صفت اوراس کی قسمیں
4.5 فعل اوراس کی قسمیں
4.6 علامت فاعل 'نے' کے استعمال کے قاعدے
4.7 علامت مفعول 'کو' کے استعمال کے قاعدے
4.8 جنس-مذکرومونث
4.9 جانداروں کی تذکیروتانیث بنانے کے قاعدے
4.10 بے جان چیزوں کی تذکیروتانیث بنانے کے قاعدے
4.11 نمونہ امتحانی سوالات

4.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کومکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ

- ☆ اسم اوراس کی قسمیں (اسم خاص،اسم عام) سے واقف ہوسکیں
- ☆ ضمیراوراس کی قسموں کے بارے میں جان سکیں
- ☆ صفت اوراس کی قسموں سے متعلق جانکاری حاصل کرسکیں
- ☆ فعل اوراس کی قسموں سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں
- ☆ علامت فاعل 'نے' اورعلامت مفعول 'کو' کے استعمال کے قاعدوں سے واقف ہوسکیں
- ☆ جنس یعنی مذکرومونث سے متعلق جانکاری حاصل کرسکیں

4.1 تمہید:

اس اکائی میں ہم آپ کو قواعد کی مکمل جانکاری دیں گے۔اسم کی تعریف کے ساتھ اس کی قسمیں (اسم خاص و اسم عام) کا جائزہ مع مثالوں کے ساتھ دیا جائے گا۔ضمیر اور اس کی قسموں کے ساتھ ہم آپ کو یہ بھی بتائیں گے کہ صفت کسے کہتے ہیں اور وہ کتنی قسموں پر مشتمل ہے۔فعل کی تین قسموں کا جائزہ مع مثالوں کے ساتھ اس اکائی میں دیا جائے گا۔علامت فاعل 'نے' اور علامت مفعول 'کو' کے استعمال کے قاعدے بھی تحریر کئے جائیں گے۔آخر میں نمونہ سوالات و جوابات کے ذریعے اس اکائی کی تفہیم کو آسان بنانے کی کوشش کریں۔

4.2 اسم اور اس کی قسمیں

اسم کی تعریف(Noun):

وہ کلمہ ہے جو کسی شخص، یا شئی یا جگہ کا نام ہو اور اکیلا ہی اپنے معنی دے۔جیسے:

ظفر اللہ، کونول، چاند، قلم، مغرب، مسجد۔

اسم کی دو قسمیں ہیں:

ا۔اسم خاص(Proper Noun):

کسی خاص شخص، خاص چیز، خاص وقت یا خاص جگہ کے نام کو اسمِ خاص کہتے ہیں۔

جیسے: اکبر، مدراس، تاج محل وغیرہ۔

۲۔اسم عام(Common Noun):

وہ اسم ہے جو کسی خاص شخص، خاص چیز، خاص وقت کا نام نہ ہو بلکہ اپنی قسم کی تمام چیزوں کے لئے یکساں طور پر بولا جائے۔

جیسے: لڑکا، درخت، مدرسہ، وغیرہ

بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی قسمیں:

اس کی تین قسمیں ہیں

(۱) جامد

(۲) مصدر

(۳) مشتق

۱۔جامد (Primitive):

وہ اسم ہے جو نہ خود کسی لفظ سے نکلا ہو اور نہ اس سے کوئی لفظ نکلے مثلاً؛

اونٹ، گھوڑا، ابراہیم

۲۔مصدر (Infinitive):

وہ اسم ہے جو خود تو کسی لفظ سے نہ نکلے بلکہ اس سے اور لفظ نکلیں۔ مثلاً؛

جانا مصدر ہے اس سے جائے گا، جانے والا، نکلتے ہیں۔

۳۔مشتق (Derivative):

وہ اسم ہے جو مصدر سے بنا ہو، مثلاً؛

کھانا سے کھانے والا، کھایا ہوا بنا ہے یہ مشتق ہیں۔

اسم خاص کی قسمیں:

اسم خاص کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱۔خطاب:

وہ نام ہے جو حکومت یا قوم کی طرف سے کسی شخص کو دیا جاتا ہے۔

جیسے: پدم شری، قائد ملت، پدم بھوشن، سر، شمس العلماء وغیرہ۔

۲۔لقب:

وہ نام ہے جو آدمی کے کسی وصف یا صفت کی وجہ سے مشہور ہو۔

جیسے: عادل (نوشیرواں کا لقب)،کلیم اللہ (حضرت موسیٰ کا لقب) وغیرہ۔

۳۔کنیت:

وہ نام ہے جو ماں باپ یا بچوں کے تعلق کی وجہ سے رکھا جائے۔

جیسے: کلو کا باپ، بدھو کی ماں، امِّ سلمیٰ، ابنِ عمر، وغیرہ۔

۴۔تخلص:

وہ مختصر نام جو شاعر اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے۔

جیسے: ذوقؔ، حالیؔ اور غالبؔ تخلص ہیں شیخ ابراہیم، الطاف حسین اور اسد اللہ خاں کے۔

۵۔عرف:

وہ نام ہے جو محبت یا حقارت کی وجہ سے مشہور ہو جائے۔

جیسے: پیارو،گلّو، جھمّن، بابو،نوشہ وغیرہ۔

اسم عام کی قسمیں:

اسم عام کی پانچ قسمیں ہیں۔

۱۔اسم کیفیت Noun of Condition:

وہ اسم ہے جس سے اسم کی کوئی کیفیت یا حالت معلوم ہو۔

جیسے: سختی، نرمی، مٹھاس،لڑکپن، نیند وغیرہ۔

۲۔اسمِ جمع Collective Noun:

ایسے اسماء ہیں جو لفظ کے اعتبار سے واحد لیکن معنے کے اعتبار سے جمع ہوتے ہیں۔

جیسے: محفل، بازار، انجمن، ٹولی وغیرہ۔

۳۔اسم ظرف:

وہ اسم ہے جو کسی جگہ یا وقت کو ظاہر کرے۔اس کی دو قسمیں ہیں؛

الف۔ظرف زماں Noun of Time:

وہ اسم ہے جس میں زمانے کے معنی ہوں۔

جیسے: صبح، شام، آج، کل، منگل، چہارشنبہ، گرما، سرما، وغیرہ۔

ب۔ظرف مکاں Noun of Place:

وہ اسم ہے جو کسی جگہ یا مقام کو ظاہر کرے۔

جیسے: کتب خانہ، چراگاہ، مدرسہ، مسجد، وغیرہ۔

۴۔اسم آلہ Noun of Instrument:

وہ اسم ہے جو کسی آلہ یا اوزار کا نام ہو۔

جیسے: تلوار، چاقو، قینچی، بیلن، بندوق، ہتھوڑی، وغیرہ۔

۵۔اسم صوت Noun of Sound:

وہ اسم جو کسی جان دار یا بے جان کی آواز کو ظاہر کرے۔

جیسے: میاؤں میاؤں، دھڑام، ٹن ٹن، دھپ دھپ، وغیرہ۔

اسمِ مصغر Diminitive Noun:

وہ اسم جو کسی چیز کو اس کی اصلی حالت سے چھوٹا ظاہر کرے۔

جیسے: باغ سے بغیچہ، ڈھول سے ڈھولک، لوٹا سے لٹیا، کھاٹ سے کھٹیا، صندوق سے صندوقچہ، پہاڑ سے پہاڑی، پیالہ سے پیالی وغیرہ۔

اسم مکبر Augmentative Noun:

وہ اسم جو کسی چیز کو اس کی اصلی حالت سے بڑا ظاہر کرے۔

جیسے: گھڑی سے گھڑ، پگڑی سے پگڑ، چھتری سے چھتر، بات سے بتنگڑ وغیرہ۔

4.3 ضمیر اور اس کی قسمیں

ضمیر Pronoun:

ضمیر وہ کلمہ ہے جو کسی اسم کی جگہ پر بولا جاتا ہے۔

جیسے: میں، ہم، آپ، یہ، وہ، وغیرہ۔

ضمیر کی پانچ قسمیں ہیں

ا۔ ضمیر شخصی Personal Pronoun:

وہ ضمیریں ہیں جو اشخاص کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

جیسے: میں، تو، وہ، ہم، آپ، تم وغیرہ۔

ضمیر شخصی کی تین صورتیں ہیں۔

الف۔ متکلم First Person:

وہ ضمیریں جو اپنی ذات کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

جیسے: میں، ہم، میرا۔

ب۔ مخاطب Second Person:

وہ ضمیریں جو مخاطب یعنی سامنے والے شخص کے لئے جس سے بات کی جارہی ہے استعمال کی

جاتی ہیں۔

جیسے: تو،تم،آپ، تیرا،تمہارا۔

ج۔غائب Third Person:

وہ ضمیریں جو کسی غیر موجود شخص کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

جیسے: وہ،اس کا۔

ضمیر شخصی کی گردان Conjugation

ضمیر	تعداد	فاعلی حالت		مفعولی حالت		اضافی حالت	
		مذکر	مونث	مذکر	مونث	مذکر	مونث
متکلم	واحد	میں آیا	میں آئی	مجھ کو دیا	مجھے دیا	میرا قلم	میری ٹوپی
	جمع	ہم آئے	ہم آئیں	ہم کو دیا	ہمیں دیا	ہمارا قلم	ہماری ٹوپی
مخاطب	واحد	تو آیا	تو آئی	تجھ کو دیا	تجھے دیا	تیرا قلم	تیری ٹوپی
	جمع	تم آئے	تم آئیں	تم کو دیا	تمہیں دیا	تمہارا قلم	تمہاری ٹوپی
غائب	واحد	وہ آیا	وہ آئی	اس کو دیا	اسے دیا	اس کا قلم	اس کی ٹوپی
	جمع	وہ آئے	وہ آئیں	ان کو دیا	انہیں دیا	ان کا قلم	ان کی ٹوپی

۲۔ضمیر اشارہ Demonstrative Pronouns:

وہ ضمیر جو کسی شخص یا چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

جیسے: یہ، وہ، اِس، اُس۔

۳۔ضمیر استفہامیہ Interrogative Pronouns:

وہ کلمات ہیں جن کے ذریعے سوال پوچھا جاتا ہے۔

جیسے: کیا؟، کون؟، کیوں؟، کس نے؟، کب؟، کہاں؟۔

۴۔ضمیر موصولہ Relative Pronouns:

وہ ضمیریں ہیں جو دو جملوں کو ملانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں اور جن کے آنے کی وجہ سے جملوں میں اس طرح کا ربط یا تعلق پیدا ہو جاتا ہے کہ جب تک دوسرا جملہ پہلے جملے کے ساتھ ملا کر پڑھا یا بولا نہ جائے تو بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔

جیسے: جو، جس کا، جس کو، جس نے، جنہوں نے۔

مثلاً: اللہ جس کو عزت دیتا ہے اسے کوئی مٹا نہیں کرسکتا،   جو محنت کرتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔

ان جملوں میں 'جس کو' اور 'جو' ضمیر موصولہ ہیں۔

پہلے جملے کو موصول اور بعد میں آنے والے جملہ کو صلہ کہتے ہیں۔

۵۔ضمیر تنکیر Indefinite Pronoun:

وہ ضمیریں ہیں جو نامعلوم اور غیر معین اشیاء کے لئے استعمال ہوں۔

جیسے: کوئی، کچھ، کسی۔

ضمیروں کی حالت کا نقشہ

اقسامِ ضمیر	فاعلی حالت		مفعولی حالت		اضافی حالت	
ضمیر اشارہ	وہ، یہ، اس نے، اس نے	وہ، یہ، اِن، اُن	اِس کو، اُس کو	اِن کو، اُن کو		
ضمیر استفہامیہ	کس نے	کنھوں نے	کسے، کس کو، کس سے	کنھیں، کن کو، کن سے	کس کا	کن کا
ضمیر موصولہ	جو، جس نے	جن، جنھوں نے	جس کو، جسے	جن کو، جنہیں	جس کا	جن کا
ضمیر تنکیر	کوئی، کسی		کسی کو		کسی کا	

4.4 صفت اور اس کی قسمیں

صفت کی تعریف Definition of Adjective:

وہ کلمہ ہے جو کسی اسم کی کیفیت، خاصیت، تعداد، رنگ یا مقدار کو ظاہر کرے۔

جیسے: جاہل، شریر، تیز، اچھا۔

ا۔ صفاتِ ذاتی Adjective of Quality:

جو صفت کسی شخص یا شئے کی ذاتی حالت یا کیفیت کو ظاہر کرے، صفاتِ ذاتی کہلاتی ہے۔

جیسے: شریر لڑکا، گول میز، ہرا پتہ۔ ان ترکیبوں میں شریر، گول اور ہرا صفتیں ہیں۔

صفاتِ ذاتی کے تین درجے ہیں:

تفضیلِ نفسی Positive Degree:

جس سے صرف کسی شخص یا شئے کی کیفیت ظاہر کرنا مقصود ہو۔

جیسے: اچھی کتاب   برا ساتھی

تفضیلِ بعض Comparative Degree:

کسی شخص یا شئے کو دوسرے شخص یا شئے سے یا کسی کیفیت میں بڑھ کر ثابت کرنے کو تفضیل بعض کہتے ہیں۔

جیسے: یہ لڑکا اس لڑکے سے زیادہ شریر ہے، یہ کتاب اس کتاب سے بھی زیادہ اچھی ہے۔

تفضیل بعض کو ظاہر کرنے کے لئے 'سے' یا 'سے بھی' کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔

تفضیل کل Superlative Degree:

کسی شخص یا چیز کو کسی کیفیت میں اس قسم کی دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر ثابت کرنے کو تفضیل کل کہتے ہیں۔

جیسے: یہ کتاب سب سے اچھی ہے، یہ لڑکا سب سے شریر ہے

صفتِ مشبہ اور اسم فاعل میں فرق یہ ہے کہ صفتِ مشبہ کے معنے میں ہمیشگی پائی جاتی ہے اور اسم فاعل کے معنے میں ہمیشگی نہیں پائی جاتی۔

جیسے: حکیم، کریم صفتِ مشبہ ہیں اور چلنے والا، بھاگنے والا اسمِ فاعل ہیں۔

منفی صفات ذاتی Negative Adjective of Quality:

چند حروف ایسے ہیں جن کو بعض لفظوں سے پہلے لگا دینے سے صفاتِ ذاتی میں نفی کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

جیسے: اَ: اَٹل، امر۔ ان: ان جان، ان پڑھ۔ بے: بے دھڑک، بے سرا، بے جان، بے غیرت۔ ن: نڈر۔

صفاتِ نسبتی Relative Adjectives:

جو صفتیں کسی دوسری چیز یا مقام سے کسی اسم یعنی اپنے موصوف کا لگاؤ اور تعلق ظاہر کریں ان کو صفاتِ نسبتی کہتے ہیں۔

جیسے: مدراسی لڑکا، آسمانی مصیبت، پہاڑی پھول۔

صفاتِ عددی Adjective of Number:

وہ صفتیں ہیں جو کسی اسم کی تعداد یا ترتیب کو ظاہر کریں۔

جیسے: پانچ کتابیں، پہلا سوال، پانچویں جماعت، دسواں لڑکا وغیرہ

صفات عددی دو طرح کے ہوتے ہیں:

معین Defined:

وہ عدد ہیں جن سے کسی چیز کی تعداد کا صحیح پتہ چلے۔

جیسے: ساتویں منزل۔

غیر معین Undefined:

وہ عدد ہے جس سے کسی چیز کی تعداد کا صحیح پتہ نہ چلے۔

جیسے: تمام کتابیں، آخری صفحہ، کل روپے، سارا غم، تھوڑا کھانا، چند روٹیاں وغیرہ۔

اسم عدد اور صفتِ عددی میں فرق یہ ہے کہ اسمِ عدد چیزوں کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے اور صفتِ عددی سے ترتیب معلوم ہوتی ہے۔

جیسے: چار، پانچ، اسمِ عدد ہیں اور چوتھا، پانچواں صفتِ عدد ہیں

صفاتِ مقداری Adjective of Quantity:

وہ صفتیں ہیں جو کسی چیز کی مقدار کو ظاہر کریں۔

جیسے: ایک مٹھی چاول، پیالی بھر گھی۔

صفاتِ ضمیری Demonstrative:

وہ الفاظ جو صفت اور ضمیر دونوں کے معنے میں استعمال کئے جائیں صفاتِ ضمیری کہتے ہیں۔

جیسے: فلاں، کون سا، کئی، ایسا، سب، ہر۔

نوٹ: صفت جس اسم کے ساتھ آئے اس کو موصوف کہتے ہیں۔

جیسے: ٹھنڈا پانی لاؤ۔ اس جملے میں ٹھنڈا صفت ہے اور پانی موصوف۔

اردو میں عام طور پر صفت پہلے اور موصوف اس کے بعد آتا ہے لیکن کبھی اس کو الٹا بھی کر لیتے ہیں۔

جیسے: پانی ٹھنڈا ہے، موسم گرم ہے، ایسی صورت میں صفت خبر واقع ہوگی۔

4.5 فعل اور اس کی قسمیں

فعل Verb کی تعریف:

فعل وہ کلمہ ہے جس سے کسی کام کا کرنا یا ہونا سمجھ میں آئے اور اس میں تین زمانوں میں سے کوئی ایک زمانہ پایا جائے۔

جیسے: رحیم گیا بارش ہوتی ہے

ان جملوں میں 'گیا' اور 'ہوتی ہے' فعل ہیں

زمانے Tenses:

زمانے Tenses تین ہیں۔

ماضی Past Tense:

گزرا ہوا زمانہ ماضی کہلاتا ہے۔

جیسے: گیا، کھایا، تھا۔

حال Present Tense:

موجودہ زمانہ حال کہلاتا ہے۔

جیسے: جاتا ہے، کھاتا ہے، پڑھتا ہے۔

مستقبل Future Tense:

آنے والا زمانہ مستقبل کہلاتا ہے۔

جیسے: جائے گا، کھائے گا، آئے گا۔

زمانے کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ فعلِ ماضی

۲۔ فعلِ حال

۳۔ فعلِ مستقبل

فعلِ ماضی:

فعلِ ماضی کی چھ قسمیں ہیں۔

۱۔ماضی مطلق

۲۔ماضی قریب

۳۔ماضی بعید

۴۔ماضی استمراری

۵۔ماضی شکّی

۶۔ماضی تمنائی

۱۔ماضی مطلق Past Indefinite:

وہ فعلِ ماضی ہے جس میں نزدیک یا دور کے زمانے کی کوئی قید نہ ہو۔

جیسے: گیا، کھایا، چلا۔

۲۔ماضی قریب Present Perfect:

وہ فعلِ ماضی ہے جس میں نزدیک کا گزرا ہوا زمانہ پایا جائے۔

جیسے: گیا ہے، کھایا ہے۔

۳۔ماضی بعید Past Perfect:

وہ فعلِ ماضی ہے جس سے دور کا گزرا ہوا زمانہ سمجھا جائے۔

جیسے: گیا تھا، چلا تھا۔

۴۔ماضی استمراری Past Continuous:

جس سے کسی کام کا گزرے ہوئے زمانے میں ہوتا رہنا سمجھ میں آئے۔

جیسے: جاتا تھا، کھاتا تھا۔

۵۔ماضی شکّی Past Imperfect:

وہ فعلِ ماضی ہے جس سے گزشتہ زمانے میں کسی کام کا ہونا شک کے ساتھ سمجھا جائے۔

جیسے: گیا ہوگا۔ کھایا ہوگا۔

٦۔ماضی تمنائی Optative:

جس سے گزرے ہوئے زمانے میں کسی کام کے کرنے یا ہونے کی تمنا کی جائے۔

جیسے: پڑھتے تو پاس ہوتے۔ بھوک لگتی تو کھاتے۔

ان جملوں میں 'پڑھتے' اور 'لگتی' ماضی تمنائی ہیں۔

ماضی مطلق کی گردان Conjugation of Past Indefinite

جنس	غائب		مخاطب		متکلم	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	وہ آیا	وہ آئے	تو آیا	تم آئے	میں آیا	ہم آئے
مونث	وہ آئی	وہ آئیں	تو آئی	تم آئیں	میں آئی	ہم آئیں

ماضی بعید کی گردان Conjugation of Past Perfect

جنس	غائب		مخاطب		متکلم	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	وہ آیا تھا	وہ آئے تھے	تو آیا تھا	تم آئے تھے	میں آیا تھا	ہم آئے تھے
مونث	وہ آئی تھی	وہ آئی تھیں	تو آئی تھی	تم آئی تھیں	میں آئی تھی	ہم آئی تھیں

افعال ماضی کا نقشہ

مصدر	ماضی مطلق	ماضی قریب	ماضی بعید	ماضی استمراری	ماضی شکی	ماضی تمنائی
آنا	آیا	آیا ہے	آیا تھا	آتا تھا	آیا ہوگا	آتا
جانا	گیا	گیا ہے	گیا تھا	جاتا تھا	گیا ہوگا	جاتا
سونا	سویا	سویا ہے	سویا تھا	سوتا تھا	سویا ہوگا	سوتا
کھیلنا	کھیلا	کھیلا ہے	کھیلا تھا	کھیلتا تھا	کھیلا ہوگا	کھیلتا
دیکھنا	دیکھا	دیکھا ہے	دیکھا تھا	دیکھتا تھا	دیکھا ہوگا	دیکھتا
بولنا	بولا	بولا ہے	بولا تھا	بولتا تھا	بولا ہوگا	بولتا

معنے کے لحاظ سے فعل کی قسمیں:

معنے کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ فعلِ لازم

۲۔ فعلِ متعدی

۳۔ فعلِ ناقص

۱۔ فعل لازم Intransitive Verb:

وہ فعل ہے جو صرف فاعل کو چاہے یعنی صرف فاعل کے ملنے سے بات پوری طرح سمجھ میں آجائے۔

جیسے: اکبر آیا، کبوتر اڑتا ہے۔

۲۔ فعلِ متعدی Transitive Verb:

وہ فعل ہے جو فاعل کے علاوہ مفعول کو بھی چاہے۔ یعنی بات پوری طرح سمجھ میں آنے کے لئے اسے مفعول کی بھی ضرورت ہو۔

جیسے: اکبر نے خط لکھا۔ بلی چوہے پکڑتی ہے۔

ان جملوں میں 'لکھا' اور 'پکڑتی' فعلِ متعدی ہیں۔

فعلِ معتدی کی دوقسمیں ہیں:

الف۔فعلِ معروف

ب۔فعلِ مجہول

الف۔فعلِ معروف Active Voice:

فعلِ معروف اس فعل کو کہتے ہیں جس کا فاعل معلوم ہو۔

جیسے: اکبرآیا احمد گیا

ان جملوں میں 'آیا' اور 'گیا' فعلِ معروف ہیں۔ 'اکبر' اور 'احمد' ان کے فاعل ہیں

ب۔فعلِ مجہول Passive Voice:

جس فعل کا فاعل معلوم نہ ہواس کوفعلِ مجہول کہتے ہیں۔

جیسے: شیرمارا گیا مضمون لکھا گیا

ان جملوں میں مارنے والے اور لکھنے والے کا پتہ نہیں چلتا۔اس لئے 'مارا گیا' اور 'لکھا گیا' فعل مجہول ہیں۔

نوٹ: فعلِ معروف میں فاعل کی اہمیت زیادہ ہوتی ہےاورفعلِ مجہول میں مفعول کی۔

۳۔فعلِ ناقص Defective Verb:

وہ فعل ہے جوکسی پراثر نہ ڈالے بلکہ کسی کام کے اثر کوثابت کرے۔

جیسے: اکبر بیمار ہے

اس جملے میں جوفاعل ہےوہ کام کا کرنے والانہیں بلکہ فعل کا سہنے والا ہےاور 'بیمار ہے' کا لفظ اس کی حالت کی خبر دیتا ہے۔

نوٹ: ا۔افعالِ ناقصہ استعمال ہونے کی صورت میں جملہ فعلیہ نہیں بلکہ اسمیہ خبریہ ہوتا ہے۔

۲۔افعالِ ناقصہ کا فاعل اور مفعول نہیں ہوتا بلکہ مبتدااور خبر ہوتے ہیں۔

فعلِ حال کی قسمیں

فعل حال Present Tense:

وہ فعل ہے جس سے کام کا موجودہ زمانے میں کرنا یا ہونا سمجھا جائے۔

جیسے: احمد آرہا ہے   ہوا چلتی ہے

فعل حال کی چھ قسمیں ہیں۔

۱۔مضارع

۲۔امر

۳۔نہی

۴۔حالِ مطلق

۵۔حالِ ناتمام

۶۔حال شکی

۱۔مضارع Aorist Tense:

وہ فعلِ حال ہے جس میں موجودہ زمانے کے ساتھ آئندہ زمانے کی جھلک بھی پائی جائے۔

جیسے: پڑھو تو کامیاب ہو گے   نیک بنو تو نیک نامی ملے

۲۔امر Imperative:

وہ فعل ہے جو کسی بات کا حکم دینے یا التجا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

جیسے: مدرسہ کو جاؤ۔   آپ یہاں تشریف رکھئے   ایک گلاس پانی لائیے۔

۳۔نہی Negative:

وہ فعل ہے جس سے کسی کام کے کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔

جیسے: باہر مت جاؤ،   دیکھو نہیں،   شور نہ کرو۔

۴۔حالِ مطلق Simple Present:

وہ فعلِ حال ہے جو زمانے کی تخصیص کے بغیر ظاہر ہو۔

جیسے: آتا ہے کھاتا ہے جاتا ہے

۵۔حالِ استمراری Present Continuous:

وہ فعل حال ہے جس سے موجودہ زمانے میں کسی کام کا جاری رہنا سمجھ میں آئے۔

جیسے: احمد آ رہا ہے قدیر بازار جا رہا ہے

٦۔حالِ شکی Doubtful Present:

وہ فعل حال ہے جس سے کسی کام کے واقع ہونے میں شک کا احتمال ہو۔

جیسے: شاید وہ آتا ہو وہ کھاتا ہو وہ پڑھتا ہو

فعلِ مضارع کی گردان Conjugation of Aorist Tense

	غائب		مخاطب		متکلم	
جنس	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر و مونث	وہ آئے	وہ آئیں	تو آئے	تم آئے	میں آؤں	ہم آئیں

فعلِ امر کی گردان Conjugation of Imperative

	غائب		مخاطب		متکلم	
جنس	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر و مونث	وہ پڑھے	وہ پڑھیں	تو پڑھ	تم پڑھو		

Conjugation of Negative فعل نہی کی گردان

جنس	غائب		مخاطب		متکلم	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر و مونث	وہ نہ لائے	وہ نہ لائیں	تو نہ لا	تم نہ لاؤ		

Conjugation of Simple Present حال مطلق کی گردان

جنس	غائب		مخاطب		متکلم	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	وہ آتا ہے	وہ آتے ہیں	تو آتا ہے	تم آتے ہو	میں آتا ہوں	ہم آتے ہیں
مونث	وہ آتی ہے	وہ آتی ہیں	تو آتی ہے	تم آتی ہو	میں آتی ہوں	ہم آتی ہیں

Conjugation of Present Continuous حال استمراری کی گردان

جنس	غائب		مخاطب		متکلم	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	وہ آرہا ہے	وہ آرہے ہیں	تو آرہا ہے	تم آرہے ہو	میں آرہا ہوں	ہم آرہے ہیں
مونث	وہ آرہی ہے	وہ آرہی ہیں	تو آرہی ہے	تم آرہی ہو	میں آرہی ہوں	ہم آرہی ہیں

فعل مستقبل کی قسمیں

فعل مستقبل وہ فعل ہے جس سے کسی کام کا کرنا یا ہونا آئندہ زمانے میں سمجھا جائے۔

جیسے: کل بارش ہوگی میں مدرسہ جاؤں گا میں ڈاکٹر بنوں گا

فعل مستقبل کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مستقبل مطلق

۲۔ مستقبل مدامی

۱۔ مستقبل مطلق Simple Future Tense:

وہ فعل ہے جس سے صرف آئندہ زمانے میں کسی کام کا کرنا یا ہونا ہی سمجھ میں آئے۔

جیسے: میں مدرسہ جاؤں گا کل بارش ہوگی کلیم آئے گا

۲۔ مستقبل مدامی Future Continuous Tense:

وہ فعل ہے جس سے آئندہ زمانے میں کسی کام کا جاری رہنا سمجھ میں آئے۔

جیسے: میں مدرسہ جاتا رہوں گا وہ کھاتا رہے گا میں سوتا رہوں گا

Conjugation of Simple Future مستقبل مطلق کی گردان

	غائب		مخاطب		متکلم	
جنس	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	وہ آئے گا	وہ آئیں گے	تو آئے گا	تم آو گے	میں آوں گا	ہم آئیں گے
مونث	وہ آئے گی	وہ آئیں گی	تو آو گی	تم آو گی	میں آوں گی	ہم آئیں گی

Conjugation of Future Continuous مستقبل مدامی کی گردان

	غائب		مخاطب		متکلم	
جنس	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	وہ آتا رہے گا	وہ آتے رہیں گے	تو آتا رہیگا	تم آتے رہو گے	میں آتا رہوں گا	ہم آتے رہیں گے
مونث	وہ آتی رہیگی	وہ آتی رہیں گی	تو آتی رہیگی	تم آتی رہو گی	میں آتی رہوں گی	ہم آتی رہیں گی

4.6 علامت فاعل 'نے' کے استعمال کے قاعدے

فعل متعدی میں ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید اور ماضی شکی کے فاعل کی علامت لفظ 'نے' ہے بشرط یہ کہ متعدی مذکور فعل لازم سے مرکب نہ ہو۔

جیسے: میں نے کھایا ہے اور اس نے مارا تھا۔

مگر بولنا، لانا اور بھولنا خارج ہیں۔ یعنی باوجود متعدی ہونے کے ان میں علامت فاعل نہیں آتی۔

جیسے: وہ لایا اور تو بھولا،

اسی طرح اگر کوئی متعدی فعل لازم سے مرکب ہو

جیسے: لے جانا اور دے بیٹھنا وغیرہ۔ تب بھی علامت فاعل 'نے' نہ بولی جائے گی۔

جیسے: میں لے گیا، وہ دے بیٹھا، تو کھا چکا، میں لے سکا وغیرہ

ا۔ جن فعلوں کے فاعلوں کے ساتھ حرف 'نے' مذکور نہیں ہوتا وہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں فاعل کے موافق بولے جاتے ہیں۔ خواہ وہ لازم وہ یا معتدی خواہ ان کے مفعولوں کے ساتھ علامت مفعول ہو یا نہ ہو۔

جیسے: زید آیا، زبیدہ گئی، ظفر اللہ لکھتا ہے، قدسیہ پڑھتی ہے، رحمت اللہ خط لکھتا ہے، زبیدہ خط پڑھتی ہے، لڑکے آئے، لڑکیاں آئیں، لڑکے کتابیں پڑھتے ہیں۔

۲۔ جن فعلوں کے فاعل کے ساتھ لفظ 'نے' علامت فاعل تو ہو مگر علامت مفعول مطلقاً نہ ہو تو وہ فعل مفعول کے موافق ہوں گے خواہ فاعل مذکر ہو یا مؤنث واحد ہو یا جمع۔

جیسے: احمد نے تختی لکھی، ہندہ نے پانی پیا، عورتوں نے شربت کے پیالے پیے۔

۳۔ اگر فاعل اور مفعول دونوں کی علامتیں مذکور ہوں تو فعل ہر حال میں واحد ہی مستعمل ہوگا خواہ فاعل اور مفعول مذکر ہوں یا مؤنث واحد ہوں یا جمع۔

جیسے: ابراہیم نے کتاب کو پڑھا، زبیدہ نے کتاب کو پڑھا۔ استادوں نے اپنے شاگردوں کو بلوایا، لڑکیوں نے اپنی کتابوں کو پڑھ لیا۔

۴۔جب مفعول کسی فعل کا جملہ واقع ہو تو بھی فعل واحد مذکر ہوگا۔
جیسے: لڑکی نے کہا کہ میں کتاب پڑھتی ہوں، لڑکوں نے پوچھا تم کونسی کتاب پڑھتی ہو۔
۵۔جب کئی اسم مذکر و مؤنث ایک فاعل کے تابع ہوں تو فعل کو آخر اسم کے موافق لائیں گے۔
جیسے: مرد، عورت، لڑکے، لڑکی آئی۔

4.7 علامت مفعول 'کو' کے استعمال کے قاعدے

۱۔جب فعل کا مفعول ذی عقل ہو تو مفعول کے ساتھ 'کو' آتا ہے۔
جیسے: ذکاءاللہ نے رحمت اللہ کو مارا، میں نے ایوب کو دیکھا۔
۲۔اگر مفعول غیر ذی عقل یا بے جان اشیاء میں سے ہے تو اس کے ساتھ 'کو' علامت مفعول نہیں آتا۔

جیسے:	میں نے	پانی	پیا	میں نے	بچھو	مارا
	فاعل	مفعول	فعل	فاعل	مفعول	فعل
		بے جان			غیر ذی عقل	

۳۔جب مفعول کے متعلق کوئی تخصیص اشارے یا اضافت وغیرہ سے پیدا کریں تو 'کو' لانا ضروری ہے۔
جیسے: میں نے جانور دیکھا، میں نے اس جانور کو دیکھا
دوسرے جملے میں تخصیص اشارے (اس) سے پیدا کی گئی ہے۔
۴۔محاورات میں جہاں مفعول مصدر کے ساتھ آتا ہے 'کو' استعمال نہیں ہوتا۔
جیسے: اس نے میری تباہی پر کمر باندھ رکھی ہے (کمر باندھنا محاورہ ہے۔)
اسی طرح بے جان اشیاء اور کیفیات قلبی کے ساتھ بھی 'کو' استعمال نہیں ہوتا۔
جیسے: میں نے خط لکھا، غم نہ کرو۔

۵۔ جب عمومیت ہوتی ہے تو 'کو' نہیں آتا لیکن جب خصوصیت کا اظہار کیا جاتا ہے یا توجہ دلانی مقصود ہو تو 'کو' بولتے ہیں۔

خصوصیت	عمومیت
میرے پرچے کو دیکھو	میں نے سب مدرسے دیکھے

۶۔ جہاں دو مفعول ہوں ایک قریب اور دوسرا بعید تو ایسی صورت میں مفعول قریب کے ساتھ 'کو' نہیں لاتے، بعید کے ساتھ لاتے ہیں۔

جیسے: میں نے تمہارا قلم عظمت کو دے دیا۔

۷۔ جہاں دو مفعول ہوں اور ان میں سے ایک شخص ہو اور دوسرا شئ تو مفعول شخصی کے ساتھ ہمیشہ 'کو' آتا ہے۔

جیسے: میں نے ظفر کو خط دیا

مفعول شخصی مفعول شئ

4.8 جنس(Gender)

ا۔مذکر Masculine:

وہ اسم ہے جو نر کے لئے بولا جائے۔

جیسے: لڑکا، گھوڑا۔

۲۔مؤنث Feminine:

وہ اسم ہے جو مادہ کے لئے بولا جائے۔

جیسے: لڑکی، گھوڑی۔

جنس کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔حقیقی

۲۔غیر حقیقی

ا۔حقیقی Animate:

جاندار چیزوں کی تذکیر و تانیث کو حقیقی تذکیر و تانیث کہتے ہیں۔

۲۔غیر حقیقی Neuter:

بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کو غیر حقیقی تذکیر و تانیث کہتے ہیں۔

4.9 جانداروں کی تذکیر و تانیث بنانے کے قاعدے:

ا۔ جن ہندی الفاظ کے آخر میں الف ہوگا وہ مذکر ہوں گے۔ جیسے: لڑکا، گدھا، اس میں فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں 'یا' تانیث کی علامت ہوتی ہے۔ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے: بڑھیا، بندریا، چڑیا۔

۲۔جن ہندی الفاظ میں یائے معروف ہوتی ہے وہ مؤنث ہوتے ہیں۔

جیسے: لڑکی، بکری۔

لیکن ایسے پیشہ وروں کے نام جن کے آخر میں 'ی' معروف ہوتی ہے مستثنیٰ ہیں۔

جیسے: مالی، دھوبی، پجاری، موچی وغیرہ۔

یا وہ الفاظ جن کے آخر میں نسبت کی وصفی 'ی' ہوتی ہے۔

جیسے: بنگالی، مصری، افیونی وغیرہ۔

اسی طرح بعض عربی کے الفاظ جیسے قاضی، منشی وغیرہ۔ یہ سب اس قاعدے کے تحت نہیں آتے۔

۳۔ مذکر کے آخری ا یا ہ کو یائے معروف سے بدل دینے سے مؤنث بن جاتا ہے۔

جیسے: بکرا سے بکری، بندہ سے بندی۔

پیشہ وروں وغیرہ کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے اگر اسے 'ن' سے بدل دیا جائے تو وہ مؤنث ہو جاتا ہے۔

جیسے: بنگالی سے بنگالن، دھوبی سے دھوبن۔ لیکن جہاں آخری الف یا ی نہ ہو وہاں مشکل پڑتی ہے۔ اس لئے زبان میں مذکر سے مؤنث جس جس طرح بنتے ہیں ان میں سے اکثر کو الگ الگ لکھ دیا گیا ہے۔

۱۔ نر کے لئے اور لفظ مادہ کے لئے اور

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
باپ	ماں	نواب	بیگم	میاں	بیوی
بھائی	بہن	داماد	بہو	غلام	لونڈی
مرد	عورت	بیل	گائے		

۲۔ مختلف علامات کے ساتھ

مذکر کے آخر کا 'الف یا ہ' مؤنث میں 'ی' (معروف) سے بدل دی جاتی ہے۔

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
گھوڑا	گھوڑی	مرغا	مرغی	چچا	چچی
اندھا	اندھی	بندہ	بندی	شہزادہ	شہزادی

۳۔آخر میں یائے معروف بڑھانے سے

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
کبوتر	کبوتری	چمار	چماری	برہمن	برہمنی
لوہار	لوہاری	ہرن	ہرنی	سنار	سناری
پٹھان	پٹھانی	تیتر	تیتری		

۴۔آخر حرف کو حذف کر کے یا بلا حذف نی یا انی کے اضافے سے

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
اونٹ	اونٹنی	ڈاکٹر	ڈاکٹرنی	راجا	رانی
فقیر	فقیرنی	مہتر	مہترانی	سور	سورنی
مغل	مغلانی	ڈوم	ڈومنی	مور	مورنی
استاد	استانی	دیور	دیورانی	جیٹھ	جٹھانی

۵۔مذکر کے آخر حرف کو ’ن‘ سے بدل دینے سے

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
دھوبی	دھوبن	پارسی	پارسن	فرنگی	فرنگن
گوالا	گوالن	مالی	مالن	ناگ	ناگن

۶۔بعض اوقات اخیر حرف میں کچھ تبدیلی کے بعد یا بغیر تبدیلی کے (یا) اضافہ کرنے سے بنتا ہے۔ جیسے: چڑا سے چڑیا، کتا سے کتیا، بندر سے بندریا وغیرہ۔

۷۔بعض اوقات مذکر اسم خاص سے بھی مؤنث بنا لیتے ہیں۔

جیسے: رحیم سے رحیمن، کریم سے کریمن وغیرہ۔

۸۔بعض غیر زبانوں کے مذکر و مؤنث بعینہ اردو میں مستعمل ہیں

جیسے: بیگ سے بیگم، خان سے خانم یا عربی کے الفاظ سلطان سے سلطانہ، ملک سے ملکہ وغیرہ۔

۹۔بعض مذکر و مؤنث یکساں استعمال ہوتے ہیں۔

جیسے: بچہ، ملازم وغیرہ۔

۱۰۔عموماً مؤنث مذکر سے بنتا ہے لیکن بعض مذکر ایسے بھی ہیں جو مؤنث سے بنتے ہیں۔

جیسے: سسرا، ساس سے، رنڈوا، رانڈ سے۔ بھینسا، بھینس سے، بلّا بلّی سے۔

۱۱۔بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جو صرف مذکر استعمال ہوتے ہیں ان کا مؤنث نہیں آتا اور بعض مؤنث استعمال ہوتے ہیں ان کا مذکر نہیں آتا۔

جیسے: بطخ، چیل، فاختہ، لومڑی، ڈائن، چڑیل، بیوہ، سہاگن وغیرہ مؤنث استعمال ہوتے ہیں۔

طوطا، کوا، الو، چیتا، باز، اژدھا، تیندوا، بھانڈ، بھڑوا، ہجڑا، وغیرہ مذکر ہیں۔

۱۲۔اکثر اوقات الفاظ کے ساتھ نر اور مادہ کا لفظ لگا کر مذکر و مؤنث بنا لیتے ہیں۔

جیسے: نر گاؤ، مادہ خرگوش وغیرہ۔

۱۳۔چھوٹے چھوٹے جانوروں میں اکثر ایک ہی جنس مستعمل ہے۔

جیسے: مکھی، چھپکلی، مؤنث۔ جگنو وغیرہ مذکر۔

4.10 بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث بنانے کے قاعدے:

۱۔ اکثر ہندی الفاظ جن کے آخر میں الف یا ہ ہوتی ہے یا فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں 'ہ' الف کا آواز دیتی ہے، مذکر ہوتے ہیں۔ جیسے: گھڑا، ڈیرا، حقہ، پیشہ وغیرہ۔ لیکن بعض اس قاعدے سے مستثنیٰ بھی ہیں۔

الف۔تمام ہندی اسمائے تصغیر جن کے آخر 'یا' ہوتا ہے۔

جیسے: ٹھلیا وغیرہ

ب۔تمام عربی کے سہ حرفی الفاظ جن کے آخر میں الف ہوتا ہے۔

جیسے: ادا، قضا وغیرہ

ج۔بعض ہندی لفظ جو سنسکرت کے ہیں اور جن کے آخر میں الف ہے کیونکہ سنسکرت میں 'ا' علامت تانیث بھی ہے۔

جیسے: گھٹا، جٹا، گنگا وغیرہ۔

۲۔جن ہندی یا غیر ہندی الفاظ کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے وہ مؤنث ہوتے ہیں۔

جیسے: مکڑی، تالی، کنجی، سبزی، کشتی وغیرہ۔

البتہ جی، گھی، موتی، پانی، دہی اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔

۳۔ایسے اسماء جو آواز کی نقل ہیں مؤنث ہوتے ہیں۔

جیسے: ٹن ٹن، چٹ چٹ، دھڑ، دھڑ وغیرہ۔

۴۔زبانوں کے نام عموماً مؤنث ہوتے ہیں۔

جیسے: اردو، فارسی، انگریزی وغیرہ۔

۵۔دنوں اور مہینوں کے نام مذکر استعمال ہوتے ہیں۔دنوں میں جمعرات مستثنیٰ ہے۔

۶۔پہاڑوں کے نام مذکر ہیں۔

جیسے: ہمالیہ، بندھیاچل وغیرہ۔

۷۔ستاروں اور سیاروں کے نام بھی مذکر ہیں۔

۸۔دھاتوں اور جوہرات کے نام بھی مذکر ہیں۔چاندی البتہ مستثنیٰ ہے۔

جیسے: سونا لوہا وغیرہ۔

۹۔کتابوں کے نام اگر مفرد ہیں تو مؤنث ہوں گے بشرطیکہ آخر میں الف یا ن ہو لیکن مرکب ہونے کی حالت میں مضاف یا موصوف کی تذکیر و تانیث پر کتاب کی تذکیر و تانیث منحصر ہے۔

۱۰۔وہ اسمائے کیفیت جو اسم یا صفت کے آخر 'پن' لگانے سے بنتے ہیں مذکر ہوتے ہیں۔

جیسے: بچپن، دیوانہ پن وغیرہ۔

۱۱۔جن الفاظ کے آخر میں گاہ ہوتا ہے وہ مؤنث ہوتے ہیں۔

جیسے: بندرگاہ، تعلیم گاہ، دانش گاہ وغیرہ۔

۱۲۔انگریزی یا دیگر زبانوں کے نئے لفظ جو اردو میں مستعمل ہیں۔ہم معنی یا قریب ہم معنی اردو لفظ کو پہلے دیکھا جائیگا اور اسی لحاظ سے انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث قرار دی جائے گی۔

جیسے: ریل، بس، کار، یہ سب گاڑیوں کی قسمیں ہیں گاڑی مؤنث ہے اس لئے یہ سب

الفاظ مؤنث بولے جاتے ہیں اس طرح روم، کمرہ، اسکول، مکتب مذکر ہیں۔

۱۳۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو بعض معنوں میں مذکر اور بعض معنوں میں مؤنث استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے:

آب: پانی کے معنوں میں مذکر ہے۔

آب: صفائی یا چمک کے معنوں میں مؤنث ہے۔

گزر: گزرنے کے حاصل مصدر جیسے میرا گزر وہاں ہوا (مذکر)۔

گزر: گزر اوقات کے معنوں میں (مؤنث)۔

مد: جزر کی ضد اور اس خط کے معنی میں جو حساب یا عرضی پر کھینچا جاتا ہے اور الف ممدودہ کے معنوں میں (مذکر)

مد: نوکری یا حساب کے صیغوں کے معنوں میں (مؤنث)

عرض: طول کی ضد (مذکر)

عرض: بمعنی التماس (مؤنث)

لگن: بمعنی لگاؤ (مذکر)

لگن: بمعنی ظرف (مؤنث)

مغرب: مقام غروب کے معنی میں (مذکر)

مغرب: وقت شام کے معنی میں (مؤنث)

تال: تالاب کے معنوں میں (مذکر)

تال: وزن موسیقی کے معنوں میں (مؤنث)

4.11 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ اسم کی تعریف کرتے ہوئے اس کی قسمیں مع مثالوں کے بیان کیجئے۔

۲۔ ضمیر کی تعریف کرتے ہوئے اس کی قسمیں مثالوں کے ساتھ واضح کیجئے۔

۳۔ صفت کسے کہتے ہیں اس کی مختلف قسمیں مع مثالوں کے بیان کیجئے۔

۴۔ فعل کی تعریف کرتے ہوئے اس کی قسموں کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ علامت فاعل 'نے' کے استعمال کے قاعدے تحریر کیجیے۔

۶۔ علامت مفعول 'کو' کے استعمال کے قاعدوں پر روشنی ڈالیے۔

۷۔ جنس کسے کہتے ہیں؟ مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

۸۔ جانداروں کی تذکیر و تانیث بنانے کے قاعدے بیان کیجیے۔

۹۔ بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث بنانے کے قاعدے تحریر کیجیے۔

کتابیات:

۱۔ غالب شاعر و مکتوب نگار۔ پروفیسر نورالحسن نقوی

۲۔ مطالعہ سرسید احمد خان۔ مولوی عبدالحق

۳۔ سرسید اور ان کے کارنامے۔ نورالحسن نقوی

۴۔ سرسید اور ان کے نامور رفقائ۔ ڈاکٹر سید عبدالحق

۵۔ قواعد اردو۔ مولوی عبدالحق

ترتیب و تدوین:

ڈاکٹر سید سجاد حسین

پروفیسر و صدر،
شعبہ عربی، فارسی و اردو،
مدراس یونی ورسٹی
چنئی-600005

نظر ثانی:

ڈاکٹر عزیز الرحمن قریشی

صدر، شعبہ اردو
وقف بورڈ کالج
مدورائی-20

MADURAI KAMARAJ UNIVERSITY

(University with Potential for Excellence)

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION

Palkalai Nagar, Madurai - 625 021, India

Ph : 0452-2458471 (30 Lines) Fax : 0452-2458265

E-mail	: mkudde@mkudde.org
General grievances	: mkuddegrievance@gm[illegible]
UG Courses	: mkuddeug@gmail.co[illegible]
PG Course	: mkuddepg@gmail.[illegible]
MBA Course	: mkuddembag@g[illegible]
MCA Course	: mkuddemcag@g[illegible]
Education Courses	: mkuddeedu@g[illegible]
Website	: www.mkudde.or[illegible]
IVRS	: 0452 - 2459[illegible]
	: 0452 - 2459[illegible]
Student Support Service	: 0452 - 24[illegible]

DDE - Examinations

Fax No. : 0452 - 2458261
E-mail : mkuace@yahoo.com
Examn., Grievance Redress Cell: 0452-2458471-Extn.515